بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

مِنۡہَاجُ الطَّالِبِیۡنَ

(فرمودہ مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۲۵ء بر موقع جلسہ سالانہ قادیان)

حضور نے تشہد اور تعوذ کے بعد حسب ذیل آیات تلاوت فرمائیں:۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ○ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ○ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ○ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ○ فَاسۡتَجَابَ لَہُمۡ رَبُّہُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ○[1]

مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں پھر ایک دفعہ اپنے اُس نشان کو پورا کرنے والا قرار دیا جو کہ اس نے اپنے مامور اور مرسل کے لئے دُنیا میں قائم کیا۔ پھر اس نے ہمیں اِس بات کی توفیق دی کہ کسی دُنیوی عزت کے لئے نہیں، کسی دنیوی خواہش کے لئے نہیں، کسی مال و دولت کے لئے نہیں، کسی آرام و آسائش کے لئے نہیں، بلکہ صرف اسی کی

ذات اور اسی کے ذکر کو بلند کرنے کے لئے اس کے ایمان پر ثبات کے لئے اِس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ پھر مَیں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری نیتوں کو درست کرے اور ہمارے عملوں کو صالح بنائے۔

اِس کے بعد مَیں اس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جسے مَیں نے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ اِس جلسہ میں آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مَیں اس مضمون کو شروع کروں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو چند ایسے امور پر مشتمل ہے جن کی طرف مَیں جماعت کو سالانہ اجتماع کے موقع پر توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں اور دوسرا حصہ جس کے متعلق ارادہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آج ہی شروع کردوں کیونکہ وہ لمبا ہے وہ علمی مضمون ہے۔ جیسا کہ مَیں پچھلے سالوں میں بیان کیا کرتا ہوں۔ اس کی حقیقت آگے چل کر بیان کروں گا۔

(اس موقع پر منتظمین جلسہ گاہ نے حضور کی خدمت میں عرض کی کہ لوگ ابھی بہت سے آ رہے ہیں لیکن جلسہ گاہ میں جگہ نہیں ہے لوگوں سے کہا جائے کہ وہ سُکڑ کر بیٹھیں تاکہ جو لوگ باہر ہیں ان کے لئے بھی جگہ نکل سکے۔ اس پر حضور نے فرمایا)۔

اب کے ہم نے بہت وسیع جلسہ گاہ بنائی تھی مگر خدا تعالیٰ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مَیں تمہاری اُمید سے بڑھ کر تمہیں سننے والے دیتا ہوں۔ احباب سُکڑ کر بیٹھیں تاکہ جو دوست باہر ہیں وہ بھی آ سکیں مگر شور نہ ہو اور دوست تقریر غور سے سنیں۔ مجھے کھانسی ہے اور کھانسی کی وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے۔ گو مجھے خدا تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ مجھے توفیق دیگا کہ مَیں جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں وہ دوستوں کو سنا سکوں مگر اسباب کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے پس احباب خاموشی سے بیٹھیں اور جو کچھ سنایا جائے غور سے سنیں۔

سب سے پہلے مَیں اُن چند غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذات کے متعلق بعض لوگوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمارے بعض دوست جنہیں باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے اُنہوں نے بیان کیا ہے اور بغیر کسی کا نام لئے بیان کیا ہے اور مَیں نے بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اُن سے نام پوچھوں میری نسبت بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ خالی بیٹھے رہتے ہیں کام کیا کرتے ہیں۔ ہمیں تو ان کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگوں کے لئے مَیں اپنی طبیعت کے برخلاف اپنے کام بیان کرتا ہوں تاکہ جن دوستوں کو اس بارے میں شک ہو اُن کا شک دُور ہو جائے۔ کیونکہ شکوک زہر کی

طرح ہوتے ہیں جو عروق میں بیٹھے رہیں تو ہلاکت اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔

مَیں چونکہ قریب کے گزشتہ ایام کی نسبت زیادہ تفصیل سے اپنے کام بتا سکتا ہوں اس لئے انہی کا ذکر کرتا ہوں تاکہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ جہاں تک میرے نزدیک میری طاقت ہے اس کے مطابق مَیں کام کر لیتا ہوں گو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ اگر کوئی دوست اس سے زیادہ کام کرنے کا طریق بتائیں تو اس پر بھی عمل کروں مگر اب مَیں جو کام کرتا ہوں ان کی تفصیل یہ ہے کہ مَیں صبح ناشتہ کے بعد مدرسہ خواتین میں پڑھاتا ہوں۔ یہ ایک نیا مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں چند تعلیم یافتہ عورتوں کو داخل کیا گیا ہے اِن میں میری تینوں بیویاں اور لڑکی بھی شامل ہیں ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ چونکہ ہمیں اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے معلّم عورتیں نہیں ملتیں اس لئے چکیں ڈال کر عورتوں کو مرد پڑھاتے ہیں آج کل میں ان عورتوں کو عربی پڑھاتا ہوں مولوی شیر علی صاحب انگریزی پڑھاتے ہیں اور ماسٹر محمد طفیل صاحب جغرافیہ۔ سوا گھنٹہ تک مَیں انہیں پڑھاتا ہوں۔ اصل وقت تو ۴۵ منٹ مقرر ہے مگر سارے استاد اپنا کچھ نہ کچھ وقت بڑھا لیتے ہیں کیونکہ مقررہ وقت کم ہے اور تعلیم زیادہ ہے۔ اس کے بعد اس کمرہ میں جہاں دوست ملاقات کرتے ہیں جاتا ہوں۔ آج کل اس کی شکل اور ہے کیونکہ ملاقات کے لئے جگہ نکالنے کے لئے وہاں سے سامان اُٹھا دیا گیا ہے۔ میرے کام کرنے کے ایام میں اس کی یہ شکل ہوتی ہے کہ وہ کتابوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہاں آکر میرا دفتری کام شروع ہوتا ہے۔ اس جگہ سوا نو بجے کے قریب آتا ہوں۔ اس وقت مَیں سلسلہ کے انتظامی کاموں اور کاغذات اور سکیموں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اسی دوران میں دس بجے کے قریب ڈاک آجاتی ہے جس میں روزانہ ساٹھ، ستّر، اسّی، سَو، سَوا سَو خطوط ہوتے ہیں جو کم از کم دو اڑھائی گھنٹہ کا کام ہوتا ہے۔ اس لئے اِس کام سے مجھے ساڑھے بارہ بجے یا ایک بجے فراغت ہوتی ہے۔ اس کے بعد مَیں کھانا کھانے جاتا ہوں پھر نماز ظہر کے لئے جاتا ہوں۔ نماز پڑھانے کے بعد پھر آکر سلسلہ کے کام جو سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں یا دفاتر کے کاغذات پڑھنے یا تدابیر سوچنے یا بعض علمی مضامین کے لئے مطالعہ کرتا ہوں کیونکہ کئی کتابیں مَیں نے لکھنی شروع کی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد پھر عصر کی نماز کے لئے جاتا ہوں۔ نماز پڑھانے کے بعد وہاں کچھ دیر دوستوں کے لئے بیٹھتا ہوں اور اگر درس ہو تو درس کے لئے چلا جاتا ہوں یا بیٹھ کر خطوط کے جواب لکھاتا ہوں کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ وہ پڑھاتا ہوں اور اس کے بعد کھانا کھا کر عشاء کی نماز تک مطالعہ کرتا ہوں اور پھر عشاء کی نماز کے بعد کام کے لئے اسی کمرہ میں چلا جاتا ہوں جہاں ۱۱

بجے سے ۱۲ بجے رات تک ترجمہ قرآن کریم کا کام کرتا ہوں۔ پھر علمی شوق کے لئے ذاتی مطالعہ کرتا ہوں مگر اس کا فائدہ بھی جماعت کو ہی پہنچتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے یا ایک بجے تک یہ مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد جب بستر پر لیٹتا ہوں تو تھکان کیوجہ سے نیند نہیں آتی۔ آنکھوں کے سامنے چیزیں ہلتی ہوئی نظر آتی ہیں کیونکہ تھکان کی وجہ سے اعصاب کانپ رہے ہوتے ہیں اسی حالت میں نیند آجاتی ہے۔ پھر صبح کی نماز کے بعد کام کا یہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ میرا کام ہے جو پچھلے تین چار ماہ سے ہو رہا ہے۔ اسی کام کے دوران میں ہستی باری تعالیٰ کے متعلق جو مَیں نے ایک جلسہ کے موقع پر تقریر کی تھی اسے قریباً قریباً دوبارہ لکھا ہے۔ اسے دو تین بجے رات تک لکھتا رہتا تھا۔ ان حالات میں جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں میرے وقت میں سے کوئی وقت ایسا نہیں بچتا جب مجھے فراغت ہو۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی مَیں سلسلہ کے متعلق تجاویز اور اہم معاملات پر غور کر رہا ہوتا ہوں اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے بیویاں یہ سمجھ کر کوئی بات دریافت کرلیں کہ اب یہ فارغ ہے تو باوجود اس طرز کی ناپسندیدگی کے مجھے انہیں خشک جواب دینا پڑتا ہے کہ کیا تم میرے چہرہ سے یہ معلوم نہیں کر سکتیں کہ کسی امر کے متعلق غور و فکر کر رہا ہوں تو بسا اوقات کھانا کھانے کے وقت بھی مجھے غور اور فکر میں ہی مشغول رہنا پڑتا ہے۔ گو طبیب اور حکیم کہتے ہیں کہ اس طرح کھانا کھانے سے کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا مگر جب کسی کو کسی بڑے کام کی فکر لگی ہوئی ہو تو پھر اُسے حکیم کا مشورہ نہیں سوجھتا۔

مجھے اپنے متعلق یہ خیال سن کر کہ مَیں کیا کام کرتا ہوں اُس ہردلعزیز کی مثال یاد آگئی جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں گدھا لے کر جا رہا تھا ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ راستہ میں انہیں کچھ آدمی ملے جنہوں نے کہا کیسے بیوقوف ہیں پیدل جا رہے ہیں اور گدھا خالی ہے۔ سوار کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہ سن کر باپ گدھے پر سوار ہو گیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد کچھ اور آدمی ملے جنہوں نے کہا کہ آج کل خون سفید ہو گئے ہیں دیکھو بیٹا تو پیدل جا رہا ہے اور باپ سوار ہے۔ یہ سن کر باپ اُتر بیٹھا اور بیٹے کو چڑھا دیا۔ تھوڑی دُور پر اَور آدمی ملے جنہوں نے کہا دیکھو بڈھا تو پیدل جا رہا ہے اور ہٹا کٹا جوان سوار ہے۔ یہ سن کر دونوں نے مشورہ کیا کہ باپ بیٹھتا ہے تو بھی اعتراض ہوتا ہے بیٹا بیٹھتا ہے تو بھی اعتراض ہوتا ہے اب یہی تدبیر ہے کہ دونوں بیٹھ جائیں یہ مشورہ کر کے دونوں گدھے پر بیٹھ گئے۔ آگے چلے تو کچھ اَور لوگ ملے انہوں نے کہا شرم نہیں آتی ایک بے زبان جانور پر ہر دو آدمی سوار بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر وہ دونوں اُتر بیٹھے اور مشورہ کرنے لگے کہ پچھلی سب

صورتیں قابل اعتراض تھیں اب کیا کیا جائے۔ آخر سوچ کر سوا اِس کے کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ دونوں مل کر گدھے کو اُٹھالیں۔ آخر اسی طرح کیا مگر گدھے نے لاتیں مارنی شروع کیں اور ایک پل پر اُلٹ کر گر گیا اور ہلاک ہو گیا اور باپ بیٹا ہر دلعزیزی کی خواہش پر افسوس کرتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ اس خیال کا مطلب یہ ہے کہ انسان خواہ کچھ کرے اس پر اعتراض ضرور ہوتا رہتا ہے۔

ہماری جماعت میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو رات اور دن کہتے رہتے ہیں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں کسی وقت کام نہیں چھوڑتے اور ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ کام ہی کیا کرتے ہیں ہمیں تو کوئی کام نظر نہیں آتا اگر نظر نہ آنے والوں کی بات سچی ہے اور یہ بیکار بیٹھنے کی علامت ہے تو اللہ تعالیٰ تو کچھ نہ کرتا ہو گا کیونکہ وہ کسی کو کام کرتا نظر نہیں آتا۔ کام کئی قسم کے ہوتے ہیں کچھ دماغی کام ہوتے ہیں اور کچھ جسمانی۔ ایک شخص جو قوم کے غم میں دن رات تدبیریں سوچتا رہتا ہے دیکھنے والا تو اس کے متعلق یہی کہے گا کہ نکما بیٹھا رہتا ہے۔ مگر کیا کوئی عقلمند بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک ٹوکری ڈھونے والا تو کام کرتا ہے مگر دماغی کام کرنے والا نکما بیٹھا رہتا ہے۔ دماغی فکر تو وہ چیز ہے جو ایک دن رات میں انسان کو بوڑھا کر دیتی ہے مگر جسمانی کام انسان کو اَور زیادہ طاقتور بناتا ہے حالانکہ دماغی کام نظر نہیں آتا اور جسمانی کام نظر آتا ہے۔ دماغی کام پاس بیٹھنے اور ساتھ رہنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جب مَیں گزشتہ سال ولایت گیا تو کئی انگریز بھی جو ملنے کے لئے آتے گو وہ مسلمان نہ تھے وہ مجھے کام میں مشغول دیکھ کر مشورہ دیتے کہ اس طرح صحت خراب ہو جائے گی آپ کچھ آرام بھی کیا کریں۔ حقیقت حال انسان کو ملنے سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْکُمْ۔[2] جس سے ظاہر ہے کہ بیوی کی گواہی خاوند کے متعلق بہت وزن رکھتی ہے۔ اس لئے مسلمان حضرت خدیجہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا کی گواہی رسول کریم ﷺ کے متعلق پیش کیا کرتے ہیں۔

ابھی چند دن ہوئے ایک مبلغ کے متعلق میرے پاس شکایت پہنچی کہ اس نے یہ یہ باتیں کہیں ہیں۔ اس پر جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اَور باتیں تو غلط ہیں البتہ یہ مَیں نے کہا ہے کہ جو آدمی ان کے ساتھ رہے اُس سے کام اِس سختی سے لیتے ہیں کہ وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ پس میرے کام کا اندازہ ساتھ کام کرنے والے کر سکتے ہیں۔

مجھے خدا تعالیٰ نے ایسی عادت ڈالی ہے کہ مجھے بچپن میں بھی مطالعہ کا شوق تھا۔ بچپن سے

میری مراد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد کا زمانہ ہے۔ میری صحت اِس عادت کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ ایک دن حضرت خلیفۃ المسیح الاول نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب سے اس کے متعلق مشورہ کیا اور مجھ سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کم سے کم سات گھنٹے ان کو متواتر سونا چاہئے ورنہ صحت خراب ہو جائے گی اور پھر سخت تاکید کی کہ سات گھنٹے متواتر سویا کرو ورنہ صحت زیادہ بگڑ جائے گی اور فرمایا یاد رکھو جو طبیب کا حکم نہ مانے وہ نقصان اٹھاتا ہے تم اِس حکم کی پابندی کرو۔ مگر باوجود اس کے سوائے سخت بیماری کے ایام کے میری نیند ساڑھے چار گھنٹہ سے چھ گھنٹہ تک ہوتی ہے اِسی وجہ سے اب اعصابی کمزوری اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ جو لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ سورتیں جو مَیں روزانہ پڑھتا ہوں بعض اوقات وہ بھی بھول جاتا ہوں اور نظر اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ بعض اوقات آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن باوجود صحت کی یہ حالت ہونے کے مَیں دن رات اس طرح کام کرتا ہوں جو مَیں نے بتایا ہے اور چونکہ اِس قسم کے خیالات دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں اس لئے مَیں نے ان کا ازالہ ضروری سمجھا ہے۔ یہی دیکھ لو جو دوست جلسہ پر آتے ہیں وہ تو سمجھتے ہوں گے کہ مَیں نے دو دن لیکچر دیا تو یہ کونسا بڑا کام ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اس لیکچر کے لئے مجھے کس قدر مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جو مسئلہ مَیں بیان کرتا ہوں اس کے متعلق مختلف مذاہب کے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے مجھے بہت کچھ ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ یہی لیکچر جو مَیں آج دینا چاہتا ہوں اس کی تیاری کے لئے مَیں نے کم از کم بارہ سو صفحے پڑھے ہوں گے گے۔ ان میں سے مَیں نے بہت ہی کم کوئی بات بطور سند کے لی ہے اور یہ صفحات مَیں نے محض خیالات کا موازنہ کرنے کے لئے پڑھے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میرے دماغ میں جو باتیں آتی ہیں محض خدا کے فضل سے آتی ہیں۔ مگر خدا کے فضل کے جاذب بھی ہونے چاہئیں اور اس کے لئے فکر کی ضرورت ہوتی ہے، مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، مراقبہ کی ضرورت ہوتی ہے پس یہ لیکچر ایک دن کی تقریر نہیں ہوتی بلکہ لمبے غور، لمبے فکر اور لمبے مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر جلسہ کی تقریریں یونہی چھپ نہیں جاتیں۔ تقریریں لکھنے والا ساری تقریریں مکمل طور پر نہیں لکھ سکتا اسے صاف کر کے لکھنے میں مہینہ کے قریب عرصہ لگ جاتا ہے اور پھر مجھے اس کی لکھی ہوئی تقریروں کی اصلاح کرنی پڑتی ہے تاکہ جس ترتیب سے مضمون بیان کیا جاتا ہے وہی قائم رہے۔

اِس کے بعد مَیں ایک اَور بات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ

مَیں بہت کم لوگوں کو ملاقات کا موقع دیتا ہوں۔ مَیں نے پچھلے جلسوں میں سے کسی میں بیان کیا تھا کہ ملاقات اپنے اندر بہت سے فوائد رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلسہ کے موقع پر باوجود بہت سا کام ہونے کے مَیں دوستوں کو ملاقات کا وقت دیتا ہوں کیونکہ جو لوگ اس طرح الگ ملتے ہیں ان میں بعض کی ایک سال، بعض کی دوسرے سال اور بعض کی تیسرے سال واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور اب مَیں اپنی جماعت کے ہزاروں آدمیوں کی پہچان رکھتا اور انہیں پہچان سکتا ہوں۔ اس ملاقات کے علاوہ بھی مَیں دوستوں کو علیحدہ ملاقات کا موقع دیتا رہتا ہوں۔ لیکن الگ ملنا تبھی ضروری ہو سکتا ہے جبکہ خاص طور پر اس کی ضرورت بھی ہو اور کوئی ایسی بات کرنی ہو جو مجلس میں نہ کی جا سکتی ہو۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوست آتے ہیں اور الگ ملنا چاہتے ہیں لیکن جب علیحدہ ملاقات کا موقع دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں مجھے اپنے لئے دُعا کے لئے کہنا تھا حالانکہ یہ بات وہ مجلس میں بھی کہہ سکتے تھے مگر اس کے لئے میرے وقت میں سے پندرہ بیس منٹ خرچ کرا دیتے ہیں۔ مَیں نے اپنے جو کام پہلے بتائے ہیں ان میں دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی ہوتا ہے۔ اور جو دوست کسی ضروری کام کے لئے علیحدہ ملنے کی درخواست کرتے ہیں انہیں میں علیحدہ ملنے کے لئے وقت دیتا ہوں۔ مگر مَیں نے چونکہ پچھلے تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ عام طور پر علیحدہ ملاقات کا وقت مقرر کر کے ایسی باتیں کہتے ہیں جو عام مجلس میں بھی کہی جا سکتی ہیں اس لئے اب جو شخص علیحدہ ملاقات کے لئے کہتا ہے اس کے متعلق مَیں اپنے سیکرٹری سے کہتا ہوں کہ پوچھ لو کہ آیا ایسا ضروری کام ہے جو علیحدگی میں ہی کیا جا سکتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے مَیں وقت دے دیتا ہوں۔ مَیں نے اپنے جو کام بتائے ہیں ان سے احباب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرا کوئی وقت فارغ نہیں ہے۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹے مجھے مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اب یہ تو میرے لئے ناممکن ہے کہ مَیں دن رات کے ۴۸ گھنٹے بنا لوں۔ پھر مَیں یہ تو کر سکتا ہوں کہ حوائج ضروریہ مثلاً کھانا، پینا، پیشاب، پاخانہ، سونا وغیرہ میں تھوڑے سے تھوڑا وقت خرچ کروں مگر مَیں ان ضروریوں کو بند نہیں کر سکتا اِن حالات میں اگر مَیں بغیر ضرورت کے علیحدہ وقت ملاقات کے لئے دوں تو اس سے دوسرے کاموں میں حرج واقعہ ہو گا۔ بعض دفعہ مَیں نے دیکھا ہے کوئی دوست ملنے کے لئے آئے تو میرا ہاتھ پکڑ کر پندرہ پندرہ بیس بیس منٹ یہی کہتے جاتے ہیں کہ میرے لئے ضرور دُعا کرنا۔ چونکہ مَیں ہر بار ان کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ضرور دُعا کروں گا اس لئے کسی کسی وقت کہہ دیتا ہوں ہاں ضرور کروں گا اور پھر خاموش ان کی بات سنتا رہتا ہوں۔ مَیں اِس طریق کو روکنا چاہتا ہوں اور یہ بھی آپ ہی لوگوں کے فائدہ کے لئے تا

کہ مَیں اپنا وقت ضروری کاموں میں لگا سکوں۔ اس طریق کی بجائے اگر کوئی صاحب میرا زیادہ وقت لئے بغیر دُعا کے لئے کہیں تو مجھے اُن کی طرف زیادہ توجہ پیدا ہو کیونکہ مَیں سمجھوں کہ ان کو میرے وقت کی قدر ہے۔ لیکن جو لوگ دیر تک ہاتھ پکڑے رکھتے ہیں اُن کے سامنے مَیں بظاہر تو بشاشت قائم رکھتا ہوں لیکن میرا دل تلملا رہا ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے میرے فلاں کام میں حرج ہو رہا ہے۔ اِس طریق سے ملاقات کرنے والوں کو مَیں روکنا چاہتا ہوں لیکن اگر کسی کو ضروری کام ہو تو اس سے مَیں دن رات میں ہر وقت ملنے کے لئے تیار ہوں۔ مَیں ملاقات کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں اور جس طرح مَیں انکو غلطی پر سمجھتا ہوں جو بِلا ضرورت اور بِلاوجہ میرا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح مَیں اُن کو بھی غلطی پر سمجھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ملنا ہی نہیں چاہئے۔ جب بھی موقع ملے یہاں ضرور آنا چاہئے اور مجھ سے ملنا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی ایسی بات کرنی ہو جو مجلس میں نہ کی جا سکتی ہو۔ مثلاً کوئی ایسی بیماری ہو یا اپنے خاص حالات ہوں یا کوئی اَور ایسی ہی بات ہو تو اس کے لئے مَیں علیحدہ ملنے کے واسطے بھی تیار ہوں اب تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کئی دوست بعض سوالات لکھ کر لاتے ہیں اور انکے متعلق علیحدہ پوچھتے ہیں۔ اُس وقت مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اگر یہی سوال مجلس عام میں پوچھتے تو اَوروں کو بھی فائدہ ہوتا۔ مثلاً یہی سوال کہ نماز میں توجہ کیونکر قائم رہ سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس سوال کا جواب اَور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ مگر پوچھنے والے صاحب علیحدہ وقت لے کر پوچھتے ہیں اور عام لوگوں کو اس کے فائدہ سے محروم رکھتے ہیں۔ اِس قسم کی علیحدہ ملاقات کرنے والوں کو روکنا چاہتا ہوں ورنہ ملاقات کا حکم تو قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ [3] جو لوگ اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق رکھتے ہیں ان سے ملتے رہا کرو۔ پس ملاقات ضروری ہے اور اس قدر ضروری ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے جو لوگ ہمارے پاس نہیں آتے اُن کے ایمان کا خطرہ ہے۔ [4] بعض لوگ ایسے ہیں جو یہاں آتے تو ہیں لیکن مجلس میں دوسروں کے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں مَیں اُن کو دیکھ رہا ہوتا ہوں لیکن ہمارے خاندان کے لوگوں کی آنکھیں اس قسم کی ہیں کہ اُوپر کو زیادہ نہیں کُھل سکتیں۔ ان کے اوپر گوشت زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے نیچے جُھکی رہتی ہیں اور اگر زیادہ کھولیں تو درد ہونے لگتا ہے۔ پس جو دوست یہاں آئیں اُنہیں مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مجھے ملیں اور انہیں یہ بھی بتانا چاہئے کہ وہ کب تک رہیں گے اور اپنے اور اپنی جگہ کے حالات سے اطلاع دینی چاہئے اس طرح اُن کی طرف خاص توجہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور اُن کے

لئے دُعا کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

اِس کے بعد مَیں ایک اَور شبہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ بعض دوستوں کا یہ خیال بیان کیا گیا ہے کہ دُعا کے لئے لکھنے کا کیا فائدہ ہے اور وہ اتنے لوگوں کے لئے کہاں دُعا کرتے ہوں گے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جس دوست کی دُعا کے لئے چٹھی آئے اُس کے لئے مَیں آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ الگ بیٹھ کر دُعا کرتا ہوں تو یہ درست نہیں۔ مَیں نہ اِس طرح کرتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں۔ سَو کے قریب روزانہ قادیان کے رُقعے ملا کر دُعا کی درخواستیں ہوتی ہیں اور بعض اِس قسم کے خطوط لکھتے ہیں کہ ہمارے لئے دُعا کرتے رہنا۔ ان کو بھی اگر ملا لیا جائے تو یہ تعداد اَور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان کے لئے اگر ایک ایک منٹ بھی علیحدہ دُعا کے لئے رکھا جائے اور پھر اسلام کی ضروریات کو شامل کیا جائے تو تین چار گھنٹے صرف ایک وقت کی دُعا کے لئے چاہئے ہوتے ہیں اس لئے مَیں اسی طرح کرتا ہوں جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کیا کرتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ خط پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ دُعا بھی کرتے جاتے۔ مَیں بھی اسی طرح کرتا ہوں۔ اس وجہ سے خط بھی خاص توجہ سے پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خط سیکرٹری کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ مجھے سنا رہا ہوتا ہے لیکن مَیں کہتا ہوں اِس میں یہ نہیں بلکہ یہ لکھا ہے اور میری ہی بات درست نکلتی ہے۔ غرض دُعا کی وجہ سے مَیں خط پڑھنے میں پوری توجہ دیتا ہوں اور خط کا سارا مضمون میرے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ ایک تو اس طرح دُعا کرتا ہوں۔ دوسرے یہ طریق مَیں نے رکھا ہے کہ نوافل میں دعا کرتا ہوں اور پچھلے دنوں سے تو جماعت کی ترقی اور مشکلات کے ازالہ کے لئے ہر فرض نماز میں دعا کرتا ہوں۔ اس دعا میں علاوہ اس کے کہ رسول کریم ﷺ پر درود پڑھتا ہوں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر بھی درود بھیجتا ہوں۔ ان کے درجات کی بلندی کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کی بعثت کے اغراض کو ہمارے ذریعہ سے پورا کرے۔ ان کے نہ ماننے والوں اور اعتراض کرنے والوں کو سمجھ دے، سلسلہ کی مشکلات اور تکالیف کو دُور کرے اور ترقی کے سامان پیدا کرے۔ پھر جب سے کابل کے واقعاتِ شہادت ہوئے ہیں روزانہ یہ بھی دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمارے وہاں کے بھائیوں کی مدد اور نصرت فرمائے اور انہیں دشمنوں کے ہر شر سے محفوظ رکھے۔ پھر یہ دُعا بھی کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اِسلام کی صداقت کو مشرق اور مغرب میں پھیلائے اور سب انسانوں کو اسلام میں داخل کرے۔ پھر ساری جماعت کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جماعت کی مالی، جسمانی، اخلاقی، علمی، روحانی ہر

قسم کی روکوں کو دُور کر کے ان تمام اقسام میں ترقی کے سامان پیدا کرے۔ پھر سلسلہ کے جو اہم کام ہوتے ہیں ان کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ پھر یہ دُعا کرتا ہوں کہ جنہوں نے مجھے دُعا کے لئے لکھا ہے اللہ تعالیٰ ان کے دُکھ اور تکالیف دُور کر کے اُن کے لئے راحت کے راستے کھول دے۔ اس وقت وہ لوگ جن کی مشکلات کا میرے دل پر خاص اثر ہوتا ہے ان کے نام لے کر ان کے لئے دُعا کرتا ہوں۔

پھر یہ دُعا کرتا ہوں کہ الٰہی! ہماری موجودہ جماعت پر ہی فضل نہ فرما بلکہ اس کی اولاد پر بھی فضل فرما۔ پھر سلسلہ کے کارکنوں کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ اُنہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کی سمجھ عطا فرما، اپنے فضلوں کا وارث بنا، لوگوں سے ہمدردی اور تعاون کا طریق سکھا، جماعت کا ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی ہو۔

پھر وہ دوست جو تبلیغ کے لئے گئے ہوئے ہیں اُن کے لئے اور اُنکے گھر والوں کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ پھر جو مصائب میں مبتلا ہیں اُن کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ یہ دعائیں پانچوں وقت بلاناغہ علاوہ نوافل کے فرض نمازوں میں کرتا ہوں۔ اب بھی اگر کوئی کہے کہ مَیں جماعت کے لئے دعائیں نہیں کرتا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کے وقت کہے سورج نہیں نکلا ہوا۔ مَیں جس طرح دعا کرتا ہوں ۹۰ فیصدی ایسے لوگ ہوں گے جو خود بھی اپنے لئے اس طرح دُعا نہیں کرتے ہوں گے۔

ایک اَور خیال مجھے بتایا گیا ہے اور یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلیفہ سے چونکہ اختلاف جائز ہے اس لئے ہمیں ان سے فلاں فلاں بات میں اختلاف ہے۔ مَیں نے ہی پہلے اس بات کو پیش کیا تھا اور مَیں اب بھی پیش کرتا ہوں کہ خلیفہ سے اختلاف جائز ہے۔ مگر ہر بات کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ اس سے بڑھنا دانائی اور عقلمندی کی علامت نہیں ہے۔ دیکھو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی ہر رائے درست ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر بیسیوں دفعہ غلطی کرتے ہیں مگر باوجود اس کے کوئی یہ نہیں کہتا کہ چونکہ ڈاکٹر کی رائے بھی غلط ہوتی ہے اس لئے ہم اپنا نسخہ آپ تجویز کریں گے، کیوں؟ اس لئے کہ ڈاکٹر نے ڈاکٹری کا کام باقاعدہ طور پر سیکھا ہے اور اس کی رائے ہم سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح وکیل بیسیوں دفعہ غلطی کر جاتے ہیں مگر مقدمات میں انہی کی رائے کو وُقعت دی جاتی ہے۔ اور جو شخص کوئی کام زیادہ جانتا ہے اس میں اس کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ پس اختلاف کی بھی کوئی حد بندی ہونی چاہئے۔ ایک شخص جو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اُسے سمجھنا چاہئے کہ خلفاء خدا مقرر کرتا ہے اور خلیفہ کا کام دن رات لوگوں کی راہنمائی اور دینی مسائل میں غور و فکر

ہوتا ہے۔ اس کی رائے کا دینی مسائل میں احترام ضروری ہے اور اسکی رائے سے اختلاف اُسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب اختلاف کرنے والے کو ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہو جائے کہ جو بات وہ کہتا ہے وہی درست ہے۔ پھر یہ بھی شرط ہے کہ پہلے وہ اس اختلاف کو خلیفہ کے سامنے پیش کرے اور بتائے کہ فلاں بات کے متعلق مجھے یہ شبہ ہے اور خلیفہ سے وہ شبہ دُور کرائے۔ جس طرح ڈاکٹر کو بھی مریض کہہ دیا کرتا ہے کہ مجھے یہ تکلیف ہے آپ بیماری کے متعلق مزید غور کریں۔ پس اختلاف کرنے والے کا فرض ہے کہ جس بات میں اُسے اختلاف ہو اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کرے نہ کہ خود ہی اس کی اشاعت شروع کر دے۔ ورنہ اگر یہ بات جائز قرار دی جائے کہ جو بات کسی کے دل میں آئے وہی بیان کرنی شروع کر دے تو پھر اسلام کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔ کیونکہ ہر شخص میں صحیح فیصلہ کی طاقت نہیں ہوتی۔ ورنہ قرآن شریف میں یہ نہ آتا کہ جب امن یا خوف کی کوئی بات سنو تو اُولِی الْاَمْرِ کے پاس لے جاؤ۔[5] کیا اُولِی الْاَمْرِ غلطی نہیں کرتے؟ کرتے ہیں مگر ان کی رائے کو احترام بخشا گیا ہے اور جب ان کی رائے کا احترام کیا گیا ہے تو خلفاء کی رائے کا احترام کیوں نہ ہو۔ ہر شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ ہر بات کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص تقویٰ کے لئے سَو بیویاں بھی کرلے تو اس کے لئے جائز ہیں۔ ایک شخص نے یہ بات سن کر دوسرے لوگوں میں آکر بیان کیا کہ اب چار بیویاں کرنے کی حد نہ رہی سو تک انسان کر سکتا ہے اور یہ بات حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمادی ہے۔ آپ سے جب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا میری تو اِس سے یہ مراد تھی کہ اگر کسی کی بیویاں مرتی جائیں تو خواہ اس کی عمر کوئی ہو تقویٰ کے لئے شادیاں کر سکتا ہے۔

پس ہر شخص ہر بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا اور جماعت کے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ اگر کسی کو کسی بات میں اختلاف ہو تو اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کرے۔ اگر کوئی شخص اس طرح نہیں کرتا اور اختلاف کو اپنے دل میں جگہ دیکر عام لوگوں میں پھیلاتا ہے تو وہ بغاوت کرتا ہے اسے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔

اس کے بعد مَیں ایک اَور نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حُقّہ بہت بری چیز ہے۔ ہماری جماعت کے لوگوں کو یہ چھوڑ دینا چاہئے۔ بعض لوگوں نے مجھے کہا ہے ہم نے ایسے ملہم دیکھے ہیں جو حُقّہ پیتے تھے اور اُن کو الہام ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا جو حضرت مسیح موعود

علیہ السلام بیان فرمایا کرتے تھے کہ کچھ بنیے بیٹھے یہ کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی ایک پاؤ تل کھائے تو اُسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔ پاس سے ایک زمیندار گزرا اُس نے یہ سن کر پنجابی میں کہا سلیاں سمیت کہ ایتویں۔ یعنی اُن شاخوں سمیت تل کھانے ہیں جن میں وہ پیدا ہوتے ہیں یا ان کے بغیر کیونکہ اس نے سمجھا ایک پاؤ تل کھانا کونسی بڑی بات ہے جس پر انعام مل سکتا ہے۔ بنیے کہنے لگے تم جاؤ ہم تمہاری بات نہیں کرتے۔ تو طبائع میں اختلاف ہوتا ہے ایک شخص کے نزدیک جو بات بڑی ہوتی ہے دوسرا اُسے معمولی سمجھتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ حُقّہ پینے والے کو خدائی الہام ہوتے ہیں تو کہنا پڑے گا کہ وہ الہام اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں گے کیونکہ رسول کریم ﷺ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ لہسن کھا کر مسجد میں نہ آؤ اس کی بدبُو کی وجہ سے فرشتے نہیں آتے۔[۶] پھر رسول کریم ﷺ کے سامنے کچا لہسن رکھا گیا تو آپ نے نہ کھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! ہم بھی نہ کھائیں۔ فرمایا۔ تم سے خدا کلام نہیں کرتا تم کھا سکتے ہو۔[۷] ان حدیثوں کے ہوتے ہوئے کس طرح مان لیں کہ حُقّہ پینے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں جبکہ حُقّہ کی بدبو لہسن سے بھی زیادہ خراب ہوتی ہے اور رسول کریم ﷺ حُقّہ سے کم بدبُو والی چیز کے متعلق فرماتے ہیں کہ مَیں اسے استعمال نہیں کرتا کیونکہ میرے پاس فرشتے آتے ہیں۔ پس جب رسول کریم ﷺ اس قدر احتیاط کرتے تھے تو جو شخص الہام کا مدعی ہے یا جسے خواہش ہے کہ اُسے الہام ہو اُسے بھی حُقّہ سے بچنا چاہئے۔ اور مَیں اس کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں جو یہ کہے کہ مجھے الہام کی خواہش نہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص نہیں تو پھر کسی کو حُقّہ بھی نہیں پینا چاہئے۔

پھر مَیں کہتا ہوں ممکن ہے ایسے شخص کو الہام ہو بھی جائے۔ مگر اعلیٰ درجہ کے الہام نہیں ہوں گے اور ہم کہیں گے اگر وہ حُقّہ نہ پیتا تو اس سے اعلیٰ الہام اسے ہوتا جیسا کہ حُقّہ پینے کی عادت رکھتے ہوئے اُسے ہوا۔ اس کے پاس ادنیٰ فرشتے آجاتے ہوں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے بعض اوقات کنچنی کو بھی الہام ہو جاتا ہے۔[۸] وہاں فرشتے جاتے ہیں یا نہیں؟ اسی قسم کے فرشتے حُقّہ پینے والے کے پاس آجاتے ہونگے۔ پس اگر کسی حُقّہ پینے والے کو الہام ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ اس کے لئے خوشی کی بات نہیں لیکن اگر وہ حُقّہ پینا چھوڑ دیتا تو اس کے پاس اعلیٰ درجہ کے فرشتے آتے۔

اس کے بعد مَیں ایک دوست کی عزت اور احترام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ مجلس مشاورت میں ایک سوال اُٹھایا گیا تھا جو ایڈیٹر صاحب "نور" کے متعلق تھا۔ خیال کیا گیا تھا کہ ان

کے ایماء سے وہ بات سوال کرنے والے نے اٹھائی ہے۔ اس کے متعلق مَیں نے اگر کی شرط لگا کر کہا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو غلطی کی ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے جب رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں سے وہ حصہ کاٹ دیا گیا تھا مگر افسوس ہے کہ ایڈیٹر صاحب فاروق نے اس ذکر کو شائع کر دیا۔ مجھے زیادہ افسوس اِس بات کا ہے کہ فاروق کے متعلق وہ باتیں کہی تھیں۔ گویا فاروق کی طرف سے مَیں نے بدلہ لے لیا تھا۔ مگر "فاروق" نے اسے کافی نہ سمجھا۔ مَیں نے اس وقت فاروق کی ممکن سے ممکن حمایت کی تھی مگر ایڈیٹر صاحب فاروق نے اس پر صبر نہ کیا اور ایک بھائی کے خلاف خود قلم چلایا۔ چونکہ اِس امر کو اخبار میں شائع کیا گیا ہے اس لئے اس کا ذب بھی مجلس میں ہی کرتا ہوں۔ یہ اگر کسی کو بُرا لگے تو وہ اپنے نفس پر افسوس کرے جس نے اس سے ایسا فعل کرایا☆۔

اب مَیں جماعت کی مالی حالت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے سلسلہ کی مالی حالت اِن دنوں نہایت کمزور ہے۔ ہمارے دوستوں سے جس قدر ممکن ہو سکتا ہے مدد کرتے ہیں مگر باوجود اس کے ہماری ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ہماری ضروریات سے مراد میری ذاتی ضروریات نہیں۔ اِن ہماری ضروریات میں مَیں بھی اتنا شریک ہوں جتنے آپ لوگ شریک ہیں کیونکہ ان سے مراد سلسلہ کی ضروریات ہیں۔ اب مشکلات کی جو حالت ہے ان کو زیادہ لمبا نہیں جانے دیا جا سکتا کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ کارکنوں کو تین تین ماہ کی تنخواہیں نہیں ملیں اور ان میں سے پچیس تیس آدمی مجھے ایسے معلوم ہیں جنہیں کئی کئی وقتوں کا فاقہ گذر چکا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک پرانے صحابی ایک دن میرے پاس آئے اور آکر رو پڑے کہ اتنے دنوں کا فاقہ ہے۔ اور کام کرتے ہوئے غشی کے قریب حالت پہنچ جاتی ہے۔ اس حالت میں مَیں نے ارادہ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں جنگل میں جا بیٹھوں مگر اس خیال سے باز رہا کہ خودکشی نہ ہو۔ آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں اِس بات کو دیر تک التواء میں نہیں رکھا جا سکتا۔ بے شک باہر کی جماعتوں کے افراد کو تکالیف کا سامنا ہے کیونکہ وہ کوئی امیر کبیر نہیں ہیں۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ کیا انکو بھی ایسی ہی تنگی درپیش ہے جیسی یہاں ہم کو ہے؟ ایک دن تو ان تکالیف کی وجہ سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری قوتِ ارادی بالکل جانے لگی ہے اور قریب تھا کہ مَیں اپنے تن

☆ ایڈیٹر صاحب فاروق نے بھی مومنانہ طور پر اسی وقت اس غلطی پر ندامت کا اظہار کر دیا تھا اس لئے ان پر بھی کوئی الزام نہیں۔

کے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ بے شک ہماری جماعت پر بہت بوجھ ہے اور وہ بہت کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتی ہے۔ مگر جماعت نے ہی سارا بوجھ اُٹھانا ہے غیروں سے تو ہم نے کچھ لینا نہیں۔ مَیں نے ابھی کہا ہے کہ ہماری جماعت نے بہت بوجھ اٹھایا ہوا ہے لیکن جماعت کی مجموعی حالت کو دیکھ کر مَیں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری جماعت نے ابھی اتنی مالی قربانی نہیں کی جتنی پہلی جماعتیں قربانی کرتی رہی ہیں۔ مَیں نے روم میں وہ مقام دیکھا ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والے اپنے دشمنوں کی سختیوں اور ظلموں سے بچنے کے لئے رہے۔ بیس میل کے قریب وہ مقام لمبا ہے۔ وہاں عیسائی اپنے گھربار مال و اموال چھوڑ کر چلے گئے تھے اور وہ فاقے پر فاقے اُٹھاتے تھے۔ سورہ کہف میں ان کا نام اصحاب کہف والرقیم رکھا گیا ہے۔ ہم چند گھنٹے کے لئے وہاں گئے۔ مگر کئی دوست وہاں ٹھہرنا برداشت نہ کر سکے حالانکہ وہ لوگ وہاں کئی سال تک دقیانوس[9] کے وقت رہے۔ وہ نہایت تنگ و تاریک گیلی مٹی کے غار ہیں سرکاری فوجوں نے ان میں سے جن کو وہاں مارا ان کی قبریں بھی وہیں بنی ہوئی ہیں اور اُن پر کتبے لگے ہیں کہ یہ فلاں وقت مارا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خدا کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور ایسی ایسی تکلیفیں برداشت کی تھیں جن کا خیال کر کے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت مسیح ناصری علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑے تھے۔ پھر آپ لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری قربانیاں بھی حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماننے والوں سے بڑی ہوں۔ مگر کیا اس وقت تک کی ہماری قربانیاں ایسی ہیں؟ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ نے فرمایا ہے۔ جو وصیت نہیں کرتا وہ منافق ہے[10] اور وصیت کا کم از کم چندہ 1/10 حصہ مال کا رکھا ہے[11] جس میں عام چندہ جو وقتاً فوقتاً کرنا پڑے شامل نہیں۔ مگر ہماری جماعت اس وقت اپنی آمد کا 1/16 حصہ چندہ میں دیتی ہے اور بعض یہ بھی نہیں دیتے بلکہ اس سے کم شرح سے دیتے ہیں اور بعض بالکل ہی نہیں دیتے مگر باوجود اس کے کہا جاتا ہے ہم پر بڑا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو کام کرنے کا ہم نے تہیہ کیا ہے وہ کتنا بڑا ہے۔ اب جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر بڑا بوجھ پڑ گیا اُن کی حالت اُس شخص کی سی ہے جو ہاتھی اُٹھانے کے لئے جائے اور جب اُٹھانے لگے تو کہے یہ تو بڑا بوجھ ہے یا اُس شخص کی سی ہے جو اپنے ہاتھ میں آگ کا انگارا پکڑنا چاہے اور پھر کہے اس سے تو ہاتھ جلتا ہے۔ پس جو قوم یہ کہتی ہے کہ وہ دُنیا کو اس طرح اُڑا دینے کی کوشش کر رہی ہے جس طرح ڈائنامیٹ پہاڑ کو اُڑا دیتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ڈائنامیٹ کی طرح پھٹ کر اپنے آپ کو تباہ کر

لے۔ کیا کبھی بارود خود قائم رہ کر کسی چیز کو اُڑا سکتا ہے؟ یا ڈائنامیٹ اپنے آپ کو تباہ کئے بغیر کوئی تغیر پیدا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو تمہیں اسی طرح کرنا پڑیگا۔ اگر تم تھوڑے سے ہو کر دُنیا کو فتح کرنا چاہتے ہو تو ڈائنامیٹ بن کر ہی فتح کر سکتے ہو کیونکہ تھوڑا سا ڈائنامیٹ ہی ہوتا ہے جو ایک بڑے خطہ کو تہہ و بالا کر دیتا ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم دُنیا کو اُڑانے سے پہلے آپ اُڑ جائیں گے۔ کیا یہ حالت تم میں پیدا ہو گئی ہے اور اس درجہ تک تم پہنچ گئے ہو؟ اگر نہیں تو ساری دُنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ تم پر بہت بوجھ پڑ گیا تم میں سے ہر ایک کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ اس نے اس مدعا اور مقصد کے پورا کرنے میں کس قدر سعی اور کوشش کی ہے جو ہر ایک احمدی کا اولین فرض ہے اور جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اگر اس بات کو مدنظر رکھ کر تم اس بوجھ کو دیکھو گے جسے تم نے اس وقت تک اُٹھایا ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم میں سے سارے کے سارے ایسے ہیں جنہیں اس بات کا احساس نہیں کہ وہ کس مقصد اور مدعا کو لیکر کھڑے ہوئے ہیں اور اس کے لئے کس قدر سعی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے مخلص بھی ہیں۔ ایک دوست جن کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار ہے انہوں نے اپنی آمدنی کے ۳/۱ حصہ کی وصیت کی ہوئی ہے یعنی بیس روپے ماہوار چندہ دیتے ہیں۔ جب چندہ خاص کی تحریک ہوئی تو اس میں انہوں نے تین ماہ کی تنخواہ دیدی اور اس طرح وہ مقروض ہو گئے۔ اس پر انہوں نے خط لکھا کہ کیا مَیں قرضہ ادا ہونے تک ۱۰/۱ حصہ آمد کا چندہ میں دے سکتا ہوں مگر اس سے ۵، ۶ دن بعد ان کا خط آگیا کہ مجھے پہلا خط لکھنے پر بہت افسوس ہوا۔ مَیں اپنی آمد کا ۳/۱ حصہ ہی چندہ میں دیا کروں گا۔ تو ایک حصہ جماعت کا ایسے مخلصین کا بھی ہے اور یہ بڑا حصہ ہے۔ مگر مَیں باقیوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ بھی ایسے ہی بنیں۔ اور ہماری تو یہ حالت ہونی چاہئے کہ ایک قطرہ بھی ہمارے اپنے لئے نہ ہو بلکہ ہمارے لئے وہی رہنا چاہئے جو ہمارا نہیں رہا۔ یعنی جان بچانے، ستر ڈھانکنے کے لئے جو خرچ ہو وہ کیا جائے باقی سب کچھ خدا کے لئے سمجھا جائے۔ دیکھیں آپ لوگ جماعت میں داخل ہو کر جو وعدہ کرتے ہیں وہ کتنا بڑا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری عزت، ہماری آبرو، ہمارا آرام، ہماری آسائش، ہماری دولت، ہماری جائداد غرضیکہ ہمارا سب کچھ خدا کا ہو گیا۔ یہ بیعت کے معنے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ میرا ہے وہ میرا نہیں بلکہ خدا ہی کا ہے۔ مثلاً سو روپیہ تنخواہ ہے تو اس کی نہیں بلکہ خدا

کے لئے ہو گئی۔ پھر جو کچھ میں جان بھی شامل ہے، یہ بھی اس کی نہیں، پھر جو کچھ میں بیوی بچے ہیں یہ بھی اس کے نہیں، کوئی عزت اور عہدہ ہے یہ بھی اس کا نہیں۔ یہ اقرار کرنے کے بعد اگر کوئی شخص چندہ خاص کے وقت کہے کہ یہ بہت بڑا بوجھ ہے تو وہ بتائے بیعت کرتے وقت اس نے جو اقرار کیا تھا اس کا کیا مطلب تھا یا تو یہ مانو کہ اس کا یہ مطلب تھا کہ بیعت کرنے یعنی اپنا سب کچھ بیچ دینے سے مراد سارا جسم نہ تھا بلکہ ایک ٹانگ یا ایک ہاتھ مراد تھا یا اس سے مراد سارا مال نہ تھا بلکہ اتنا اتنا مال تھا تو ان کی رعایت رکھ لی جائے لیکن اگر یہ اقرار تھا کہ میں اپنا سارا مال جان، بیوی، بچے، عہدے سب تجھے دیتا ہوں تو پھر وہ کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ بوجھ پڑ گیا۔ بوجھ کے معنے تو یہ ہیں کہ گویا وہ کہتا ہے جس قدر دینے کا مَیں نے اقرار کیا تھا اس سے زیادہ دینا پڑ گیا یا جس چیز کے دینے کا وعدہ کیا تھا اس کے علاوہ اَور بھی دینی پڑی حالانکہ اس کا اقرار یہ ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ دیدیا ایسی حالت میں وہ بوجھ کس طرح کہہ سکتا ہے۔ مَیں امید رکھتا ہوں کہ تمام دوست بیعت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے اور اسلام کے لئے جو کچھ خرچ کرنا پڑیگا کریں گے اور جب تک خرچ کرنا پڑیگا کریں گے۔ کیونکہ جب تک اس بات میں خوشی محسوس نہ ہو کہ اسلام کے لئے سب کچھ قربان کر دیا جائے گا اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ مَیں دُعا کرتا ہوں کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

موجودہ مالی مشکلات کو دُور کرنے کے لئے فی الحال یہ تجویز کی گئی ہے کہ چونکہ آمد کے بجٹ سے چالیس ہزار خرچ زیادہ ہے اس لئے چندہ خاص مستقل طور پر اس وقت تک مقرر کر دیا جائے جب تک یہ خرچ معمولی آمد سے پورا نہ ہو جائے۔ یعنی ہماری جماعت کے لوگ اپنی ایک ماہ کی آمد کا ۴۰ فیصدی ہر سال عام چندہ کے علاوہ ادا کرتے رہیں۔ مَیں اس سے نہیں ڈرتا کہ کچھ لوگ کمزور ہوں گے جو اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ ایسے کمزور دوسروں کے لئے طاقت کا باعث نہیں ہوا کرتے بلکہ کمزور کرنے کا موجب ہوتے ہیں وہ ترقی کرنے والوں کے راستہ میں پتھر ہوتے ہیں ان کا ہٹ جانا ہی مفید ہوتا ہے۔ پس اگر اس وجہ سے کچھ لوگ پیچھے ہٹیں گے تو ہٹ جائیں ان سے ہمیں کوئی نقصان نہ ہو گا بلکہ ہماری کمر ان کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

پس اس وقت تک کہ معمولی آمد ہمارے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو جائے سالانہ ایک ماہ کی آمد کا ۴۰ فیصدی چندہ خاص میں دینا ہو گا۔ آپ لوگ یہ مت خیال کریں کہ یہ کام کس طرح چلے گا۔ مَیں اِس وقت ان کو مخاطب نہیں کرتا جو قوی ہیں بلکہ ان کو مخاطب کرتا ہوں جو کمزور

ہیں اور جو ہمارے لئے بوجھ بنے ہوئے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کا سلسلہ ہے۔ مَیں نے یہ جگہ اُسوقت دیکھی تھی جب یہ ویران پڑی تھی اور وہ وقت بھی دیکھا ہے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کے لئے نکلتے تو ایک آدھ آدمی آپ کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ بھی آپ کا ملازم۔ مگر آج خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نہیں بلکہ آپ کے غلام کی یہ حالت ہے کہ ہجوم میں سے چور کی طرح بھاگ کر نکلتا ہے تاکہ ہجوم میں گھر نہ جائے۔ پس وہ خدا جو ایک سے بڑھا کر اتنے آدمی کر سکتا ہے اور جو لاکھوں روپیہ چندہ بھیج سکتا ہے وہ آئندہ بھی اِس سلسلہ کو بڑھائے گا۔ اس وجہ سے مَیں ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ یہ سلسلہ ترقی نہیں کرے گا اور دُنیا کی کوئی روک اس کے رستہ میں حائل ہو جائے گی۔ پس مَیں سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں پر مُہر لگ چکی ہے کہتا ہوں خدا کے فضل سے یہ سلسلہ ان مشکلات سے نکلے گا اور انہی کے ہاتھ سے خدا تعالیٰ فتح و نصرت دیگا جو آج کمزور سمجھے جاتے ہیں ار جو واقعہ میں کمزور ہیں بھی۔ دیکھو بہادر جرنیل وہی سمجھا جاتا ہے جو معمولی سپاہیوں کو لیتا اور ان کے ذریعہ عظیم الشان کام کر کے دکھاتا ہے۔ مَیں اپنے لئے نہیں کہتا کیونکہ یہ سلسلہ خدا کا سلسلہ ہے اس لئے جس کے سپرد بھی خدا تعالیٰ اس سلسلہ کا انتظام کرے گا۔ اُسے ایسی قوت اور طاقت بخشے گا کہ آج جو کمزور نظر آتے ہیں انہی کے ہاتھوں فتح حاصل ہو گی۔ انہیں اپنے نفسوں پر بد ظنی ہو تو ہو مگر مجھے حسن ظنی ہے اور اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی وہ دن آئے گا جب میری حسن ظنی پوری ہو کر رہے گی۔

پھر مَیں کہتا ہوں اگر مالی اخراجات ہماری جماعت کے لوگوں پر بوجھ ہیں تو دوست کیوں تبلیغ پر خاص زور نہیں دیتے۔ مَیں نے انہیں کب روکا ہے کہ وہ جماعت کو نہ بڑھائیں۔ وہ کیوں نہیں جلدی جماعت بڑھاتے تاکہ یہ بوجھ کم ہو جائے۔ یہ ہمارا قصور نہیں بلکہ ان کا اپنا ہی قصور ہے۔ آپ لوگ اگر جماعت بڑھائیں تو مالی بوجھ آپ ہی کم ہو جائے۔ گو اصل بات تو یہ ہے کہ مؤمن کا یہ بوجھ مرنے کے بعد ہی کم ہوتا ہے زندگی میں نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر مَیں دوستوں کو یہ خوشخبری بھی سنانا چاہتا ہوں کہ اِس سال دو اور ملکوں میں ہماری جماعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن میں ایک تو وہ ملک ہے جہاں عیسائیوں نے سو سال تک تبلیغ کی تھی تب جا کر انہیں کچھ کامیابی ہوئی تھی مگر ہمارے مبلّغ کو چند دن میں پندرہ سولہ سعید روحیں مل گئی ہیں۔ وہ سماٹرا اور جاوا کا علاقہ ہے۔ دوسرا وہ ملک ہے جس کا نام لینے سے میرے خون میں جوش اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایران کا ملک ہے۔ ایران وہ ملک ہے جس سے حضرت مسیح موعود

علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نسبت ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسیح فارسی النسل ہو گا۔[۱۲] ایران کے دارالخلافہ میں بیس کے قریب آدمی احمدیت میں داخل ہو چکے ہیں اور اس کے متعلق یہ اَور بھی خوشی کی بات ہے کہ وہاں ہمارے جو مبلّغ گئے ہیں انہیں ہم کوئی خرچ نہیں دیتے۔ وہ شہزادہ عبدالمجید صاحب ہیں جو شاہ شجاع کی اولاد سے ہیں اور لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے خدمت دین کے لئے زندگی وقف کی تھی۔ میں نے انہیں ایران بھیج دیا۔ ان کے تازہ خط سے معلوم ہوا ہے کہ کئی ایسے لوگ جو بارسوخ اور معزز ہیں اور جن کا ہزاروں آدمیوں پر اثر ہے سلسلہ کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔

ایک اَور بات مَیں سنانا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ ہمارے سلسلہ کی کس طرح تبلیغ کر رہا ہے۔ پچھلے سال ترکستان میں کُردوں کی جو بغاوت ہوئی تھی وہ ایک شخص شیخ سعید کے ماتحت ہوئی تھی۔ وہ اتنی بڑی بغاوت تھی کہ اس کے فرو کرنے کے لئے تُرکوں کو ۳ لاکھ آدمی جمع کرنے پڑے تھے اور عصمت پاشا وزیراعظم جیسے مشہور آدمی کو ان کا کماندار مقرر کیا گیا تھا۔ شیخ سعید جب پکڑے گئے اور ان کا بیان لیا گیا تو انہوں نے کہا اگر فلاں واقعہ نہ ہوتا تو مَیں کبھی بغاوت میں شامل نہ ہوتا۔ کیونکہ مَیں ارادہ کر چکا تھا کہ مَیں ہندوستان چلا جاؤنگا اور جماعت احمدیہ میں شامل ہو کر تبلیغ اسلام کرونگا۔ اگرچہ ان کو تُرکوں نے قتل کرا دیا اور وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے۔ مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے بڑے بڑے آدمیوں نے احمدیت قبول کی ہوئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ صاحب سلسلہ سے پوری طرح واقف نہ تھے ورنہ حکومت کے خلاف بغاوت میں کبھی شامل نہ ہوتے۔

مَیں نے مالی مشکلات کی وجہ سے کہا ہے کہ اس وقت تک کوئی نیا کام نہ بڑھایا جائے جب تک حالت درست نہ ہو۔ امریکہ کے مشن پر اب خرچ کم کر دیا ہے اور ہندوستان میں آئندہ سال سے زیادہ کوشش کی جائے گی تاکہ یہاں کی جماعت زیادہ بڑھے اور زیادہ بوجھ اُٹھا سکے مگر جہاں یہ ضروری ہے کہ ہماری جماعت زیادہ قربانی کرے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جن سامانوں کے ذریعہ وہ قربانی کر سکتی ہے ان کو بڑھایا جائے۔ انگریزی میں مثل ہے کہ سونے کا انڈا لینے کے لئے مرغی کو مار نہ ڈالنا چاہئے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جماعت کی مالی اصلاح اور ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اس کے لئے ایک تو یہ ضروری ہے کہ جماعت کے لوگ ایک دوسرے سے تعاون کریں مختلف مقامات پر ٹرنک سازی، سیاہی سازی، لنگیاں بنانا، آزار بند بنانا، کلاہ وغیرہ مختلف قسم کی

صنعتیں جاری ہیں۔ اگر مختلف جگہ کے احمدی تاجر احمدی صناعوں سے اشیاء خریدیں تو ان کی بکری وسیع ہو سکتی ہے اور ان کی آمد زیادہ ہونے کی وجہ سے سلسلہ کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پس احمدی تاجر احمدی صناعوں سے مال خریدیں اور احمدی گاہک احمدی دکانداروں سے خریدیں تو اس طرح بھی بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے مبلغوں کو بھی اس کام میں مدد دینی چاہئے۔ جہاں جائیں دیکھیں کہ کونسی صنعت کوئی احمدی کرتا ہے اور جب دوسری جگہ جائیں تو وہاں کے لوگوں کو بتائیں کہ فلاں مال فلاں احمدی بناتا ہے اس سے خریدا جائے۔

میرے نزدیک اس پہلو میں ترقی دینے کا ایک آسان طریق یہ بھی ہے کہ مجلس مشاورت کے وقت ایک نمائش بھی ہو جایا کرے جس میں احمدی صناع اپنی بنائی ہوئی چیزیں لا کر رکھیں تاکہ دوست واقف ہو جائیں کہ فلاں چیز فلاں جگہ سے مل سکتی ہے اور پھر ضرورت کے وقت وہاں سے منگالیں۔ پھر احمدیوں کو چاہئے کہ بیکار احمدیوں کو ملازم کرانے کی کوشش کریں۔ بعض دوستوں نے اس بارے میں بڑی ہمت دکھائی ہے مگر اکثر سستی کرتے ہیں اسی طرح جماعت کے لوگوں کو چاہئے تجارتی شہروں میں جا کر تجارت اور صنعت سیکھیں۔

اسی طرح ایک ضروری امر پسماندگان کی مدد ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سب کچھ دین کے لئے قربان کر دو تو جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں ان کے فوت ہونے پر ان کے پسماندگان کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ ایسے حاجتمندوں کے لئے ایک فنڈ ہونا ضروری ہے جس میں چندہ دینا لازمی نہ ہو بلکہ مرضی پر ہو اور اس کے لئے ایسا قانون بنا دیا جائے کہ جو اتنا چندہ دے اسے اتنے عرصہ کے بعد اتنی رقم بالقطع دی جائے گی یا اگر فوت ہو جائے تو پسماندگان کو اتنی رقم ادا کر دی جائے۔ اگر کسی ایسے فنڈ کا انتظام ہو جائے تو پسماندگان کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق میں تفصیلی طور پر اس وقت نہیں بیان کر سکتا۔ میرا ارادہ ہے کہ مجلس مشاورت میں اسے پیش کیا جائے اور اسے ایسے رنگ میں رکھا جائے کہ سود نہ رہے۔ انشورنس نہ ہو اور کام بھی چل جائے۔ مثلاً یہی فیصلہ ہو کہ اس عمر تک پسماندگان کو گزارہ دیا جائے گا یا یہ کہ بچوں کو اس قدر تعلیم دلائی جائے گی۔

اس قسم کی تحریکات بھی جماعت کی مالی حالت کی درستی کے لئے ضروری ہیں جن کے متعلق تجاویز سوچی جائیں گی تاکہ شرعی لحاظ سے ان میں کوئی نقص نہ ہو اور پسماندگان کے گزارہ کا کوئی معقول انتظام ہو سکے۔ جس سے ہماری جماعت کے لوگوں کو ایک گونہ اعتماد حاصل ہو سکے کہ ان کے بعد ان کی اولاد خطرہ میں نہ ہو گی گو مومن کا اعتماد تو خدا پر ہی ہوتا ہے۔

اب مَیں وہ مضمون شروع کرتا ہوں جس کے متعلق مَیں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ میرے دل میں مدت سے یہ خواہش تھی کہ یہ مضمون بیان کروں۔ یہ ایسا اہم مضمون ہے کہ ہر انسان کے دل میں اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے اور بے شمار لوگوں نے اس کے متعلق مجھ سے پوچھا ہے اور اس کے بارے میں نسخہ دریافت کیا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ کونسے ذرائع ہیں جن پر عمل کر کے انسان گناہوں سے پاک ہو جائے اور نفس میں نیکیاں پیدا ہو جائیں۔ عام طور پر اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیکی کرو، نیکی کرو اور گناہوں سے بچو، گناہوں سے بچو لیکن جیسا کہ ہر ایک شخص کے تجربہ میں آیا ہے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کو پڑھا، احادیث کو پڑھا، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں کو پڑھا اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کی مگر ہم کُلّی طور پر نہیں بچ سکے۔ نیکی کرنے کے لئے ہم نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اب بتاؤ ہمارا کیا علاج ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس نقطہ سے بحث کی جائے کہ کس طرح انسان کی اس کمزوری کو دُور کیا جائے کہ وہ باوجود ارادہ اور کوشش کے گناہوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب مَیں نے اِس مضمون کے متعلق نوٹ لکھنے شروع کئے تو خیال کر کے کہ یہ مضمون عرفان الٰہی کے مضمون کے بعض حصوں سے ٹکرائے گا اس تقریر کا مطالعہ کیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مَیں نے اس تقریر میں وعدہ کیا ہوا تھا کہ یہ مضمون بیان کروں گا۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اب مَیں اس وعدہ کو پورا کرنے لگا ہوں۔

پھر جب مَیں اس مضمون پر غور کرنے لگا تو ایک پرانی اور بہت پرانی رؤیا مجھے یاد آ گئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے ایک آدھ ماہ بعد مَیں نے یہ رؤیا دیکھی تھی اور اس وقت اس کی کوئی تعبیر نہ سوجھتی تھی۔ رؤیا یہ تھی کہ ایک مصلّٰی ہے جس پر مَیں نماز پڑھ کے بیٹھا ہوں میرے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس کے متعلق مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی کی ہے اور اس کا نام مِنْهَاجُ الطَّالِبِيْنَ ہے یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے والوں کا رستہ۔ مَیں نے اس کتاب کو پڑھ کر رکھ دیا کہ پھر یکدم خیال آیا کہ یہ کتاب حضرت خلیفہ اول کو دینی ہے اس لئے مَیں اسے ڈھونڈنے لگا ہوں مگر وہ ملتی نہیں۔ ہاں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک اَور کتاب مل گئی۔ اس وقت میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ [۱۳] اور تیرے رب کے لشکروں کو سوائے اُس کے اَور کوئی نہیں جانتا۔

اس کے بعد مَیں نے اس خیال سے کہ اگر شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی کی کوئی کتاب اس نام

کی ہو تو اُسے تلاش کروں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول سے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ ان کی اِس نام کی تو کوئی کتاب نہیں۔ البتہ غنیۃ الطالبین نام کی کتاب ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اِس نام کی کسی اور کی کتاب بھی نہیں ہے۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کہ کسی وقت مجھے ہی اس نام کی کتاب لکھنے کی توفیق ملے اور عبدالقادر سے مراد یہ ہو کہ اس میں جو کچھ لکھا جائے وہ میرے دماغ کا نتیجہ نہ ہو بلکہ خدا تعالیٰ کی سمجھائی ہوئی باتیں ہوں۔ اِس وجہ سے مَیں نے اس مضمون کا نام مِنْهَاجُ الطَّالِبِيْنَ رکھا ہے۔

اس مضمون کے جن حصوں کا تعلق عرفان الٰہی اور مسئلہ نجات سے ہے ان میں سے بعض کو تو چھوڑ دوں گا اور جن کا تسلسل مضمون کے لئے ذکر کرنا ضروری ہو گا ان کو مختصراً بیان کروں گا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ پہلے اس مضمون کے علمی پہلو بیان ہوئے، اب مَیں عملی پہلو بیان کروں گا۔

اس ضروری اور اہم مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی پیدائش کی غرض کیا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ نے خود بیان کر دی ہے۔ فرماتا ہے۔ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [14] کہ ہم نے انسان کو ایک ہی کام کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ عبد بن جائے۔ عبودیت کے معنے عربی میں تذلّل کے ہیں۔ اور تذلّل کا یہ مفہوم ہے کہ جو دوسرے کا نقش قبول کرے۔ تو عبد کے معنے ہیں حکومت تسلیم کر لینا، نقش تسلیم کر لینا، اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے سوائے اس غرض کے انسان کو اَور کسی غرض کے لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ میرے نقش کو قبول کرے۔ جب انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہے تو ہم اس وقت تک اسے پورا نہیں کر سکتے جب تک خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب نہ کر لیں۔

خدا تعالیٰ نے انبیاء کو بھی اسی غرض کے لئے بھیجا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ [15]

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام دُعا فرماتے ہیں۔ اے ہمارے رب ان میں ایسا رسول بھیجیو جو ان میں تیری آیات پڑھے انہیں شریعت سکھائے، حکمت بتائے اور پاک کرے، تُو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی یہ غرض ہوتی ہے کہ ایمان مضبوط کرے، علم مضبوط کرے، شریعت سکھائے اور حکمت سکھائے یعنی علم کے بعد عمل سکھائے اور اس طرح پاک کر کے خدا

تعالیٰ کی مقدس مجلس میں بیٹھنے کے قابل بنا دے۔

ہماری جماعت کے لئے یہ سوال کوئی معمولی سوال نہیں بلکہ ان کی زندگی اور موت کا سوال ہے کیونکہ اس وقت خدا کا ایک نبی آیا ہے جسے ہم نے قبول کیا ہے اور جس نے خدا کی آیات پڑھ کر ہمیں سنائی ہیں۔ اگر اس کو مان کر بھی ہم گندے رہے تو اس کو ماننے کا کیا فائدہ ہوا۔ مولوی برہان الدین صاحب جہلمی بہت مخلص احمدی تھے۔ حضرت مسیح موعودؑ ایک دفعہ بیان فرما رہے تھے کہ مؤمن کے یہ یہ درجات ہونے چاہئیں۔ تقریر ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب چیخیں مار کر رو پڑے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہنے لگے پہلے ہم وہابی ہوئے اور ہم نے رسول کریم ﷺ کی باتوں کی اشاعت کرنے کی وجہ سے ماریں کھائیں پھر آپ آئے اور ہم نے آپ کو مانا اس وجہ سے مخالفین سے ماریں کھائیں پتھر کھائے نقصان اٹھائے (مولوی صاحب موصوف یہ باتیں پنجابی میں کہہ رہے تھے جو مَیں نے اُردو میں بیان کی ہیں۔ لیکن اگلا فقرہ مَیں اُردو میں بیان نہیں کر سکتا اس لئے پنجابی میں ہی دُہراتا ہوں۔ کہنے لگے۔ مگر باوجود اس قدر تکالیف اُٹھانے کے مَیں دیکھتا ہوں کہ مَیں "فیروی چُڈُّو دا چُڈُّو ہی رہیا"۔ یعنی کسی کام کا نہ بنا۔ پس اگر ایک نبی کو مان کر بھی وہی بات ہو کہ ہم نکمے کے نکمے ہی رہیں تو ہمیں کیا فائدہ ہوا۔ ہمارے اندر تو ایسی تبدیلی اور ایسا تغیر ہونا چاہئے کہ ہمیں محسوس ہو کہ ہم نے زندہ انسان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے بلکہ یہ محسوس ہو کہ ہم نے خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے ورنہ اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہوئے تو گویا ہم نے کچھ نہ کیا۔ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم سے کیا خواہش رکھتے اور ہمیں کتنا خطرناک ڈراتے ہیں۔ آپ تزکیۂ نفس کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"تزکیۂ نفس اسے کہتے ہیں کہ خالق و مخلوق دونوں طرف کے حقوق کی رعایت کرنے والا ہو۔ خدا تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ جیسا زبان سے وحدہٗ لا شریک اسے مانا جائے ایسا ہی عملی طور سے اسے مانیں اور مخلوق کے ساتھ برابر نہ کیا جاوے۔ اور مخلوق کا حق یہ ہے کہ کسی سے ذاتی طور پر بُغض نہ ہو، تعصب نہ ہو، شرارت انگیزی نہ ہو، ریشہ دوانی نہ ہو۔ مگر یہ مرحلہ دُور ہے ابھی تمہارے معاملات آپس میں بھی صاف نہیں۔ گلہ بھی ہوتا ہے، غیبتیں بھی ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے حقوق بھی دباتے ہیں۔ پس خدا چاہتا ہے کہ جب تک تم ایک وجود کی طرح بھائی بھائی نہ بن جاؤ گے اور آپس میں بمنزلہ اعضاء نہ ہو جاؤ گے تو فلاح نہ پاؤ گے۔ انسان کا جب بھائیوں سے معاملہ صاف

نہیں تو خدا سے بھی نہیں۔ بیشک خدا کا حق بڑا ہے مگر اس بات کو پہچاننے کا آئینہ کہ خدا کا حق ادا کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ مخلوق کا حق بھی ادا کر رہا ہے یا نہیں۔ جو شخص اپنے بھائیوں سے معاملہ صاف نہیں رکھ سکتا وہ خدا سے بھی صاف نہیں رکھتا۔ یہ بات سہل نہیں یہ مشکل بات ہے۔ سچی محبت اَور چیز ہے اور منافقانہ اَور۔ دیکھو مؤمن کے مؤمن پر بڑے حقوق ہیں۔ جب وہ بیمار پڑے تو عیادت کو جائے اور جب مرے تو اس کے جنازہ پر جائے۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر جھگڑا نہ کرے بلکہ درگزر سے کام لے۔ خدا کا یہ منشاء نہیں کہ تم ایسے رہو۔ اگر سچی اخوت نہیں تو جماعت تباہ ہو جائے گی"۔[16] اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

یہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نصائح ہیں تقویٰ کے متعلق۔ پس اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے رسول کریم ﷺ کی بعثت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اب مَیں یہ تعریف بیان کرتا ہوں کہ انسان کامل کون ہوتا ہے۔ جیسے طِبّ کے لحاظ سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ تندرست آدمی کون ہے۔ اسی طرح روحانیت کے لحاظ سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ انسان کامل کون ہوتا ہے۔

انسان کامل بننے کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ انسان کا تعلق مخلوق سے بھی درست ہو اور خدا تعالیٰ سے بھی درست ہو یہ دونوں باتیں ضروری ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انسان کامل کے لئے قرار دی ہیں۔ انسانوں سے تعلق کا درست رکھنا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ (۱) یہ کہ انسان کا اپنے نفس سے تعلق درست ہو۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ وَ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ۔[17] تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔ (۲) یہ کہ دوسری مخلوق سے اس کا تعلق درست ہو۔ اپنے نفس کے متعلق جو تعلیم ہے وہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ (۱) انسان ان امور سے مجتنب رہے کہ جو اس کے دل کو خراب کرنے والے ہیں۔ (۲) ان امور پر عمل کرے جن سے دل پاک ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ کی بھی تین شاخیں ہیں۔ یعنی (i) بنی نوع انسان سے بحیثیت افراد انسان کا تعلق درست ہو۔ (ii) اس کے تعلقات بنی نوع انسان سے بحیثیت جماعت درست ہوں۔ یعنی قانونِ ملکی کے لحاظ سے دوسروں

کے ساتھ تعاون کرے۔ (iii) اس کے تعلقات انسانوں کے علاوہ خدا تعالیٰ کی دوسری مخلوق سے بھی درست ہوں۔

پھر آگے ان کی دو شاخیں ہیں۔ (الف) ان امور سے مجتنب رہے جو بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کو خراب کرتے ہوں۔ (ب) ان امور پر کاربند ہو جن سے بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق سے اس کا تعلق احسان پر مبنی ہو جائے۔

پھر خدا تعالیٰ سے تعلق درست رکھنے کے بھی دو حصے ہیں۔ (۱) ان افعال سے اجتناب کرے کہ جو اس تعلق کو توڑنے والے ہیں۔ (۲) ان افعال پر کاربند ہو جو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو بڑھاتے ہیں۔

اِس تقسیم کے بعد مَیں یہ بتاتا ہوں کہ دین اور مذہب کے کیا معنے ہیں کیونکہ ان سب باتوں کا خلاصہ دین ہے۔ اور اب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ دین کی تشریح کیا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دین دو شقوں میں منقسم ہے۔ یعنی دین کے دو حصے ہیں (۱) اخلاق۔ (۲) روحانیت۔ مَیں نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے۔ جنہیں یہ دھوکا لگا ہے کہ وہ اخلاق کو ہی دین سمجھتے ہیں۔ جس کے اخلاق اچھے ہوں اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وہ بڑا نیک ہے حالانکہ اس کے متعلق ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آدھا حصہ درست ہے مگر اسے نیک یعنی دیندار اور متقی نہیں کہہ سکتے۔

اخلاق کی تعریف

انسان کے اعمال کا وہ حصہ جو بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے اخلاق کہلاتا ہے۔ اور وہی معاملہ جب خدا تعالیٰ سے کیا جائے تو اسے روحانیت کہتے ہیں۔ اگر کوئی انسان بندوں سے جھوٹ بولتا ہے تو وہ بد اخلاق ہے اور اگر خدا سے جھوٹ بولتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کی روحانیت مُردہ ہو گئی ہے۔ اور جب کسی کے دونوں پہلو درست ہوں تب ہی وہ دیندار اور متقی کہلا سکتا ہے۔ پس جب اخلاق مطابق شریعت کئے جائیں تو وہ روحانیت کے ساتھ مل کر دین کہلاتے ہیں۔ لیکن جب وہی افعال بغیر روحانیت سے اشتراک کے تمدن کے طور پر کئے جائیں تو ایسے انسان کے متعلق کہتے ہیں کہ بڑا با اخلاق ہے۔

مَیں پہلے اخلاق کو لیتا ہوں پھر روحانیت کو بیان کرونگا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اخلاق اور روحانیت میں فرق صرف یہی ہے کہ ہماری طاقتوں کا ظہور انسانوں کے ساتھ معاملات میں اخلاق کہلاتا ہے اور انہی طاقتوں کا خدا تعالیٰ کے متعلق ظہور روحانیت کہلاتا ہے۔ اس لئے جہاں مَیں اخلاق بیان کرونگا وہاں ساتھ ہی روحانیت کا بھی پتہ لگ جائے گا۔ اور جہاں فرق بتانے کی

ضرورت ہوگی وہاں فرق بیان کردوں گا۔

اخلاق کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ خُلق کیا چیز ہے۔ اس کے متعلق اسلام کے سوا سب مذہبوں نے اور فلسفیوں نے لغزشیں کھائی ہیں اور اس کی عجیب عجیب تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً (۱) بعض کے نزدیک خُلق اس گہری جڑ رکھنے والے ملکہ کا نام ہے جس سے انسانی اعمال بِلا فکر و رویہ آپ ہی آپ سرزد ہوتے ہیں۔ یا جس کے ماتحت انسان بِلا فکر و رویہ کسی فعل کے کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ (۲) بعض کے نزدیک خُلق وہ نیک مادہ ہے کہ جو انسان کے اندر خدا کی ذات پر دلالت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ (۳) بعض کے نزدیک خُلق وہ مادہ ہے جو لمبے تجربہ کے بعد انسان میں پیدا ہو گیا ہے اور اب ورثہ کے طور پر انسانوں میں آتا ہے۔ یورپ کے فلاسفر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

میرے نزدیک خُلق اس حالت کا نام ہے جبکہ طبعی تقاضے قوتِ فکر کے ساتھ ملا دیئے جائیں اور ان تقاضوں سے کام لینے والی ہستی مقتدر ہو۔ یعنی چاہے تو ان سے کام لے اور چاہے تو ترک کر دے۔ اگر یہ افعال ایسے وجود سے ظاہر ہوں جس میں قوت فکر نہ ہو تو وہ طبعی تقاضے کہلاتے ہیں جیسے حیوانوں میں ہوتا ہے۔ حیوان محبت اور پیار کرتے ہیں مگر ان کو بااخلاق نہیں کہہ سکتے بلکہ طبعی تقاضے کہتے ہیں۔ پھر اگر اس قسم کے افعال ایسے وجودوں سے ظاہر ہوں جنہیں خاص رنگ میں بنایا گیا ہو جیسے نباتات یا جمادات تو انہیں ظہور قدرت کہیں گے۔

مضمون کا یہ حصہ مشکل ہے۔ اگر بعض دوست اسے نہ سمجھ سکیں تو جب یہ کتاب کی شکل میں چھپ جائے گا اُس وقت سمجھ جائیں گے۔ مگر اس کے بغیر چونکہ مضمون کا اگلا حصہ نہیں چل سکتا اس لئے بیان کرتا ہوں۔ اگلا حصہ آسان ہے وہ سب دوست سمجھ سکیں گے۔

مَیں اخلاق کی تعریف بیان کر چکا ہوں۔ اخلاق وہ افعال ہیں جو ایسے لوگوں سے صادر ہوں جن میں سوچنے اور فکر کرنے کی طاقت ہو اور کام کرنے یا نہ کرنے کی قابلیت پائی جائے۔

اب مَیں اخلاق حسنہ کی تعریف بیان کرتا ہوں۔ اخلاق حسنہ کی تعریفیں بھی مختلف لوگوں نے مختلف کی ہیں۔ (۱) چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق حسنہ انسانی طاقتوں کے عقل کے ماتحت استعمال کرنے کا نام ہے۔

(۲) بعض کے نزدیک اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جو انسان کو حقیقی خوشی پہنچاتے ہیں۔

(۳) بعض کے نزدیک اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جن میں ایثار سے کام لیا گیا ہو یعنی اپنا نقصان

کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچایا گیا ہو۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جو عقل کی روشنی اور اس کے انتظام کے ماتحت ذاتی نفع کی غرض سے ایثار کے طور پر کئے جائیں۔

(۵) مسلمان صوفی کہتے ہیں جو افعال عقل اور شریعت کے ماتحت کئے جائیں وہ اخلاق حسنہ ہوتے ہیں۔

امام غزالی نے اخلاق حسنہ کی یہی تعریف کی ہے لیکن یہ تعریف میرے نزدیک کچھ اصلاح کی محتاج ہے۔ اور وہ اصلاح یہ ہے کہ وہ افعال عقل اور شریعت کے مطابق بھی ہوں اور ساتھ ہی یہ بات بھی پائی جائے کہ ان کا مرتکب اپنی مرضی، ارادہ اور مقدرت سے ان افعال کو کرے۔ اگر یہ شرط نہیں پائی جاتی تو وہ اخلاق حسنہ نہیں کہلا سکتے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نیم خوابی کی حالت میں کسی کو ایک روپیہ دیدے اور جاگتے ہوئے صدقہ و خیرات سے پرہیز کرے تو اس کا نیم خوابی میں صدقہ کرنا اچھا خُلق نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ اس کا یہ فعل ارادہ کے ماتحت نہیں ہو گا۔ پس وہ افعال اخلاق حسنہ ہوتے ہیں جو شریعت اور عقل کے ماتحت ارادہ سے کئے جائیں۔ پھر ایک یہ شرط بھی ہے کہ وہ اعمال خدا تعالیٰ کی صفات کے مطابق ہوں خلاف نہ ہوں۔ یہی تعریف صحیح ہے۔ کیونکہ خوبی وہی ہو سکتی ہے جو نقص اور غلطی سے پاک ہو۔ اور کوئی شئے ہماری عقل کے پاک کہنے سے پاک نہیں ہو سکتی بلکہ خدا تعالیٰ کی صفات کی شہادت سے جو چیز پاک ہے وہی حقیقی طور پر پاک ہو سکتی ہے اور خوبی کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی کامل طور پر بے عیب ہے۔

اب مَیں اخلاق کے منبع کو بیان کرتا ہوں کہ اخلاق کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف سرچشمے بتائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اخلاق کا منبع قوت فکر یہ یعنی عقل، غضب اور شہوت ہیں۔ عقل کام کرتی ہے جیسے سوار کام کرتا ہے اور غضب اور شہوت دو گھوڑے ہیں۔ عقل کا سوار جب ان دو گھوڑوں کو درست چلاتا ہے تو خُلق پیدا ہوتا ہے اور اگر سوار غلطی کرے تو بد خُلقی پیدا ہوتی ہے محی الدین ابن عربی اس قوتِ فکر کا نام نفس ناطقہ رکھتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ تمام اخلاق ان تینوں مادوں کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی عقل اور شہوت کے ملنے سے یا عقل اور غصہ کے ملنے سے یا تینوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے۔ وہ عقل کو مرد قرار دیتے ہیں اور شہوت اور غصہ کو دو بیویاں۔ جس طرح مرد کے عورت کے ساتھ ملنے سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح کہتے ہیں عقل کے قوت غضبیہ یا قوت شہوت کے ساتھ ملنے سے

اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

بعض کے نزدیک انسان میں خوشی حاصل کرنے کی زبردست خواہش ہے یہ جب عقل سے ملتی ہے تو اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک اخلاق کے منبع کو مسلمانوں نے قرآن کریم کی روشنی میں بھی اچھی طرح نہیں سمجھا۔ مَیں نے قرآن کریم پر غور کر کے یہ سمجھا ہے کہ اخلاق کا منبع بہت گہرا ہے اور دُور تک چلا جاتا ہے۔ اگر صرف انسان میں افعال پائے جاتے جن کو اخلاق کہا جاتا ہے تو جو تعریف پہلوں نے کی ہے وہ صحیح ہوتی مگر اس قسم کے افعال نچلی چیزوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں عقل، شہوت اور غصہ سے مل کر اخلاق بنتے ہیں اور محبت بھی ایک خُلق ہے جو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں عقل اور شہوت یا عقل اور غصہ کے ملنے سے تمام اخلاق بنتے ہیں مگر حیوانوں میں عقل نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے محبت جسے اخلاق میں شمار کیا جاتا ہے پائی جاتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا عقل، شہوت اور غصہ اخلاق کا منبع نہیں ورنہ حیوانوں میں کوئی خُلق نہ پایا جاتا۔

مَیں نے اِس مضمون پر غور کیا ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا جدید مضمون میری سمجھ میں آیا ہے کہ جس نے اخلاق کے مسئلہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ دراصل اخلاق کی جڑ چند قوتیں ہیں جو نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانات میں بلکہ نباتات میں بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں اور نہ صرف جمادات میں ہی پائی جاتی ہیں بلکہ ان ذرات میں بھی پائی جاتی ہیں جن سے جمادات بنتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو انسان سے اُتر کر حیوان میں بھی انسان کے مشابہ اعمال پائے جاتے ہیں۔ انسان میں غصہ ہے، حیوان میں بھی غصہ ہوتا ہے۔ انسان محبت کرتا ہے حیوان بھی محبت کرتا ہے۔ اب ہم اِس سے اَور نیچے چلتے ہیں یعنی نباتات کو لیتے ہیں۔ ان میں بھی ہمیں ایسے افعال ملتے ہیں جو حیوانات اور انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہاں یہ فرق بے شک ہے کہ نباتات میں وہ افعال بہت ادنیٰ درجہ کے نظر آتے ہیں۔ مثلاً جس طرح انسان میں لینے اور دینے کی خواہش ہے اسی طرح نباتات میں بھی ہوتی ہے۔ اور اب نئی تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ قریباً تمام نباتات میں نر و مادہ ہیں (گو قرآن کریم میں یہ مضمون پہلے سے بیان ہو چکا ہے) اور جب نر مادہ سے ملے تب پھل بنتا ہے۔ کھجور کے متعلق یہ بات ہزاروں سال سے معلوم ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نباتات میں شہوت موجود ہے۔ پھر ان میں غصہ بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بوس نے آلات کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے۔ موٹی مثال چھوئی موئی کی بوٹی دیکھ لو۔ انگلی لگاؤ تو سُکڑ جائے گی۔ اگر اس کے پھل

کو ہاتھ لگایا جائے تو اپنے اندر کا بیج باہر پھینک کر سُکڑ جاتا ہے۔ امریکہ میں ایک درخت ہے اگر گوشت والی چیز اس کے قریب جائے تو خوش ہو کر پھیل جاتا ہے اور اگر وہ چیز اس کے ساتھ لگ جائے تو سُکڑ جاتا ہے اور اس کا خون چوس کر اُسے پھینک دیتا ہے۔ اِس قسم کی مثالوں سے ثابت ہے کہ نباتات میں بھی یہ احساس پائے جاتے ہیں۔ اب ہم اَور نیچے چلتے ہیں اور جمادات کو لیتے ہیں۔ کہتے ہیں انسان میں محبت ایک بہت اعلیٰ خُلق ہے۔ مگر محبت کیا ہے۔ محبت اپنی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں۔ پھر کیا مقناطیس لوہے کو اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ اس میں بھی یہ جذبہ ہے مگر بہت سادہ جذبہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں بجلی کی ایک ہی قسم کی طاقت اگر دو چیزوں میں پیدا کر دی جائے تو وہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے پیچھے ہٹتی ہیں۔ گویا ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار کرتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ محبت اور کشش نفرت اور غصہ کا مادہ جمادات میں بھی پایا جاتا ہے۔

پھر مَیں نے بتایا ہے کہ یہ طاقتیں باریک ذرّات میں بھی موجود ہیں۔ اگر ان میں یہ طاقتیں نہ ہوتیں تو پھر دُنیا بن ہی نہ سکتی تھی۔ اگر ذرّات ایک دوسرے کو کھینچ کر آپس میں اکٹھے نہ ہوں تو کسی چیز کا دُنیا میں قائم ہونا ناممکن ہو جائے۔ یہ جذب کرنے کی طاقت ہی ہے جس نے ذرّات کو آپس میں ملایا ہوا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اخلاق کا مادہ بہت گہرا ہے۔ گو یہ درست ہے کہ جتنے جتنے ہم نیچے جائیں بعض اخلاق کا ہی پتہ لگتا ہے اور بعض کا نہیں لگتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جڑ ہر جگہ موجود ہے۔

اِس امر کو مثالوں سے ثابت کر دینے کے بعد کہ اخلاق کا ظہور جن خاصیتوں سے ہوتا ہے وہ ذرّات عالم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ وہ کونسی خاصیتیں ہیں جو اخلاق کا مادہ ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ کی ابتدائی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادہ میں شش جہات ہیں یعنی اُوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے۔ اسی طرح چھ باطنی جہات بھی ہیں اور وہ بھی اپنی نسبت کے لحاظ سے اِسی طرح جوڑا جوڑا ہیں جس طرح ظاہری جہات جوڑا جوڑا ہیں۔ یعنی جس طرح ظاہری جہات ایک نسبت کے لحاظ سے مثلاً دائیں ہوتی ہیں تو دوسری نسبت سے بائیں، ایک نسبت سے آگے ہوتی ہیں اور ایک نسبت سے پیچھے، ایک نسبت سے اوپر ہوتی ہیں تو دوسری نسبت سے نیچے۔ اسی طرح باطنی چھ جہات بھی نسبتوں کے لحاظ سے دو دو قسم ہوتی ہیں یعنی ذکوری و اناثی، دوسروں پر اپنی تاثیر ڈالنے والی اور دوسروں سے اثر قبول کرنے والی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس چیز پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا جو اثر نہ قبول کر سکے۔ مثلاً آٹا نرم ہوتا ہے، اس میں مُٹھی گھُس جاتی

ہے مگر میز میں نہیں گھس سکتی کیونکہ یہ اس کے اثر کو قبول نہیں کرتی۔ اس سے معلوم ہوا تبھی کوئی کام ہو سکتا ہے جبکہ ایک طرف کام کرنے کی طاقت اور دوسری طرف اثر قبول کرنے کی قابلیت ہو۔ ہر ذرہ جو پایا جاتا ہے اس میں کھینچنے اور کھینچے جانے کی طاقت ہے۔

پہلی باطنی جہت جذب یعنی کھینچنے کی طاقت ہے اور اس کے ساتھ کی مَیل یعنی جھکنا۔ جب موافق سامان پیدا ہو جائیں گے وہ کھینچنے لگ جائے گا یا دوسری طرف کھنچ جائے گا۔ اسی طرح دوسری جہت دفع کی ہے اور اس کے ساتھ کی دوسری طاقتِ اعراض کی۔

تیسری خصوصیت ہر ذرہ میں اِفناء کی ہے۔ ہر چیز جو اپنا وجود قائم کرتی ہے دوسری اشیاء کو فنا کرتی ہے۔ مثلاً مَیں اپنا ہاتھ یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھوں تو پہلے ہاتھ رکھنے کی جو شکل بنی تھی وہ فنا کر کے دوسری بنائی گئی۔ اسی طرح ذرّات جب اثر قبول کر کے نئی شکل اختیار کرتے ہیں تو پہلی پر فنا وارد ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابل کی خصوصیت فنا کی ہوتی ہے۔ یعنی ہر ذرہ میں جہاں دوسرے کو فنا کرنے کی قابلیت ہے وہاں اس میں خود فنا ہونے کی بھی قابلیت ہے۔

چوتھی خصوصیت اِبقاء کی ہے۔ کوئی چیز گراؤ آگے دیوار ہو تو وہ اُسے ٹھہرا لے گی۔ یہ باقی رکھنے کی طاقت ہے۔ اس کے مقابل کی خصوصیت بقاء ہے یعنی باقی رہنے کی قابلیت۔

پانچویں خصوصیت اِظہار کی ہے۔ یعنی بعض چیزوں کو اُبھارنا، ظاہر کرنا۔ ہر ذرہ دوسرے کو اُبھارتا ہے، اسے موٹا اور نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ کی خصوصیت ظہور ہے یعنی ہر ذرہ میں نمایاں ہونے اور ظاہر ہونے کی خصوصیت بھی ہے۔

چھٹی خصوصیت اِخفاء ہے۔ یعنی کسی چیز کو مخفی کر دینا۔ مثلاً میرے ہاتھ کے پیچھے کوئی چیز ہو تو وہ اسے چُھپا دیگا۔ اس کے مقابلہ میں خفاء یا چھپنے کی طاقت ہے یعنی اپنے وجود کو مخفی کر دینا اور دوسرے کے سایہ میں آجانا۔

یہ طاقتیں جو مادہ کے باریک سے باریک حصہ میں پائی جاتی ہیں اخلاق کی بنیاد ہیں۔ تمام اخلاق کی بنیاد انہی پر ہے۔ اور یہی ترقی کرتے کرتے انسان میں ایک حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں مادہ مرکّب ہوتا جاتا ہے اجزاء ملتے جاتے ہیں اس کے افعال میں زیادتی اور صفائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں مادہ ترقی کرتا ہے یہ خاصیتیں اعلیٰ پیرایہ میں اور مختلف اقسام سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جس قدر ادنیٰ ہوتا جاتا ہے ان خصوصیات کا ظہور ادنیٰ اور محدود ہوتا جاتا ہے جب تک خالص مادی قوانین کے ماتحت یہ خاصیتیں عمل کرتی ہیں اُس وقت تک ہم ان کے ظہوروں کو

اچھا اور بُرا تو کہہ سکتے ہیں مگر اخلاق فاضلہ یا سیئہ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح ہر چیز جو کام نہ دے ہم اُسے بُرا اور جو کام دے اسے اچھا کہنے لگ جاتے ہیں اور اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ ان چھ خاصیتوں کا ظہور ان سے قانونِ قدرت کے مطابق پوری طرح ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ دیکھو یہ سوئی اگر کسی پر جاگرے تو اسے بُرا محسوس ہو گا مگر یہ نہیں کہے گا کہ یہ سوئی کی بد خُلقی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو کہیں پڑا ہوا ایک پیسہ مل جائے تو وہ کہے گا اچھی بات ہے مگر یہ نہ کہے گا کہ پیسہ کی بڑی مہربانی ہے۔ پس جب تک افعال مادی ظہور کے مطابق ہوں ہم انہیں اچھا یا بُرا تو کہہ سکتے ہیں مگر اخلاق نہیں قرار دے سکتے۔ اچھا یا بُرا کہنے سے مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ہمارے منشاء کے مطابق وہ کام کر رہے ہیں یا ہمارے منشاء کے خلاف۔

بعض دفعہ اچھائی یا بُرائی نسبتی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو گولی لگی تو جو اُس شخص کے ہمدرد ہوں گے وہ کہیں گے بُرا ہوا لیکن جو مخالف ہوں گے وہ کہیں گے اچھا ہوا۔ یہ بُرائی اور اچھائی نسبتی ہے ہم اسے خُلق نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک طبعی قوت کا اظہار ہے جو طبعی قوانین کے ماتحت ظاہر ہو رہی ہے۔ ارادہ کا چونکہ دخل نہیں اس لئے اسے خُلق بھی نہیں کہتے مگر فعل ایک ہی قسم کا ہے۔

ہاں مگر جب ترقی کرتے کرتے مادہ انسانی شکل اختیار کرتا ہے تو یہ چھ خاصیتیں سینکڑوں شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ چونکہ انسان مادہ سے مرکّب در مرکّب ہو کر بنا ہے اور اس وجہ سے یہ خاصیتیں بھی اس کے اندر مرکّب در مرکّب ہوتی چلی گئی ہیں۔ ان کی مثال رنگوں کی ہے جو اصل میں تو صرف چھ سات ہیں مگر ان کو مرکّب کر کے سینکڑوں رنگ پیدا کر لئے گئے ہیں۔ چونکہ انسان میں ان خاصیتوں کا ظہور نئے رنگ میں ہونے لگتا ہے اسے خلق کہتے ہیں۔ گویا وہ ایک نئی پیدائش ہے۔ اور خلق یعنی جسمانی پیدائش سے ممتاز کرنے کے لئے اسے خُلق کہنے لگے ہیں ورنہ اصل میں وہی چھ خاصیتیں ہیں جو ابتدائی سے ابتدائی مادہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جب تک وہ جمادات میں کام کرتی ہیں ان کو طاقتیں کہتے ہیں۔ جب نباتات میں ایک زیادہ مکمل ظہور ان کا ہوتا ہے انہیں حِسّیں کہتے ہیں۔ جب حیوانات میں اس سے بھی زیادہ مکمل ظہور ہوتا ہے تو انہیں شہوات یا طبعی تقاضے کہتے ہیں۔ اور جب اس سے بھی زیادہ مکمل صورت میں انسان میں ان کا ظہور ہوتا ہے تو فکر اور ارادے کے بغیر ان کے ظہور کو طبعی تقاضے یا اظہار فطرت کہتے ہیں۔ اور جب ارادے یا فکر کے ماتحت ان کا ظہور ہوتا ہے اسے خُلق کہتے ہیں۔ یعنی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔ جیسے قرآن کریم میں بھی انسان کی تخلیق کے متعلق آتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ [۱۸] انسان کو خدا نے سب سے اعلیٰ مخلوق بنا دیا اور سب خلق اس کے ماتحت آ گئی۔

اب اس اصل کو سمجھ لینے کے بعد انسانی اخلاق پر غور کرو۔ سب اخلاق کا باعث یہی سیدھے سادھے خواص جو مادے میں پائے جاتے ہیں نظر آتے ہیں جو مختلف مدارج ارتقاء کے بعد اس حالت کو پہنچ گئے ہیں اور اس وجہ سے ان کو اپنی ذات میں ہم ہرگز بُرا نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ طبعی تقاضے ہیں۔ ہم انہیں تبھی بُرا کہہ سکتے ہیں جب وہ بے محل استعمال ہوں۔ مثلاً بُزدلی ہے، سب لوگ اسے بُرا کہتے ہیں۔ لیکن کیا اس کا یہی مطلب نہیں ہے کہ ایک بات سے انسان پیچھے ہٹتا ہے اور خالی پیچھے ہٹنا بُرا نہیں کہلا سکتا وہ اعراض کے قدرتی جذبہ کا اظہار ہے۔ ہم اسے تبھی بُرا کہیں گے جب کہ وہ فعل عقل اور مقتضائے وقت کے خلاف کیا گیا ہو۔ چنانچہ ہم زُہد کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی پیچھے ہٹنے کا ہی فعل ہے لیکن سب لوگ اسے اچھا کہتے ہیں حالانکہ دونوں فعلوں کی شکل ایک ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ فعل بھی اپنی ذات میں نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ بلکہ جب عقل اور مقتضائے وقت کے مطابق یہ فعل ہو تو اچھا ہے ورنہ بُرا خواہ اس کا نام زہد رکھو یا کچھ اَور۔ اسی طرح صبر ہے، اس میں بھی خاصیت اِعراض کا ہی ظہور ہے۔ اور ہم اسے اچھا تبھی کہیں گے جب یہ عقل و مقتضائے وقت کے مطابق ہو ورنہ نہیں۔

اب مَیں ایک مثال خاصیت مَیل کی بیان کرتا ہوں اور وہ عاشقانہ محبت کی یعنی اُس محبت کی جو مُحِبّ اپنے محبوب سے کرتا ہے مثال ہے۔ ایک مرید اپنے پیر سے یا شاگرد اپنے اُستاد سے اس قسم کی محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے حسن کو دیکھ کر جو اپنے اندر جذب رکھتا ہے اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ جب یہ محبت عقل و مقتضائے وقت کے ماتحت ہوتی ہے خُلق حسن کہلاتی ہے۔ اور جب ایسی نہ ہو تو آوارگی اور کمینگی۔ لیکن دونوں حالتوں کے اندر حقیقت ایک ہی پوشیدہ ہے اور وہی خاصیت دوسرے کی کشش کو قبول کر لینے کی جو مادہ میں بھی موجود تھی ایک دوسری شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔

قوت دفع سے پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں بہادری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہادری کیا ہے۔ وہی خاصیت دفع کی جو مادہ میں موجود تھی اس شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور جب موقع مناسب پر استعمال کی جائے تو خُلق حسن کہلاتی ہے ورنہ بد خُلقی۔ گالیاں دینے کی عادت بھی اسی خاصیت کی

ایک شاخ ہے۔ اس کی غرض بھی دوسرے کے الزام یا حملہ یا ظلم کو اپنے سے دُور کرنا ہوتی ہے۔

قوت جذب کا ایک ظہور ہے۔ قوت جذب دوسری اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی مادۂ حرص جس وقت انسانی افعال میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی حرص کی شکل میں اموال اور رتبوں کو کھینچنے میں لگ جاتا ہے اور جب ناجائز طور پر ظاہر ہوتا ہے تو اسے بُرا۔ ورنہ اچھا کہتے ہیں۔ اسی خاصیت کے ماتحت بشاشت یعنی خوش خُلقی سے ملنا بھی ہے اور مدح اور محبت، محبوبی اور ورع اور اشاعت حق کے لئے جھگڑنے کی صفات بھی اسی جذبہ کے ماتحت ہیں۔

فناء کی خاصیت سے پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں تہوّر کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ تہوّر اس جذبہ کو کہتے ہیں کہ انسان اپنی فنا کا فیصلہ کر لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ مَیں اپنی جان کی بالکل پرواہ نہیں کرونگا۔ یہ جذبہ بھی کبھی عقل کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس وقت یہ جذبہ نہایت اعلیٰ ہوتا ہے جیسے نعمت اللہ خان نے کیا کہ جان دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا مگر ایمان کی حفاظت کی۔ جب عقل کے ساتھ صحیح طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں یہ قربانی ہے لیکن جب عقل کے ماتحت نہ ہو جیسے آگ جل رہی ہو اور کوئی اس میں گر کر اپنے آپ کو جلا دے تو یہ بھی تہوّر ہی ہے۔ لیکن عقل کے ماتحت نہیں اس لئے بُرا ہے۔

دوسری مثال اس جذبہ کی احسان ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے کی خاطر اپنا حق چھوڑ دیتا ہے اور ایک حد تک اپنے لئے فنا کے سامان پیدا کرتا ہے، کیونکہ وہ ان اشیاء کو جو اُسکے بقاء کے لئے تھیں دوسروں کو دیدیتا ہے۔

اِفناء کی خاصیت سے پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں قتل، غارت، کینہ کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان اخلاق کی تہہ میں اِفناء کی خواہش کا زور معلوم ہوتا ہے۔

اِبقاء کی خاصیت کے ماتحت پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں سخاوت، امید، احسان اور اسی قسم کے اَور اخلاق کو پیش کیا جا سکتا ہے (احسان کو پہلے فناء کے نیچے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ بعض اخلاق مرکّب ہوتے ہیں اور دو خاصیتوں سے مل کر پیدا ہوتے ہیں یا مختلف وقتوں میں مختلف جذبات کا ظہور ہوتے ہیں)

کبر، دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش، شجاعت، خودپسندی، ظہور کی خاصیت سے پیدا ہونے والے اخلاق میں شمار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تہہ میں ظاہر ہونے کی خواہش مخفی ہے۔

اِفشاءِ سِرّ، رِیاء، بے حیائی، صدق ایسے اخلاق میں جو اِظہار کی خاصیت کے غیر مادی ظہور

ہیں۔

توکّل، غفلت اور حیاء کے اخلاق قوتِ خفاء یعنی پوشیدہ ہو جانے کے مادہ سے ترقی کر کے پیدا ہوتے ہیں۔

اِستہزاء، مزاح، جھوٹی گواہی، رازداری، جھوٹ، اِخفاء کی خاصیت کا غیر مادی ظہور معلوم ہوتے ہیں۔

بعض اخلاق مرکّب ہوتے ہیں جیسا کہ حسد، جذب اور اِفناء سے مرکّب ہے اور حقد اعراض اور افناء سے مرکّب ہے۔

بعض اخلاق مختلف حالتوں میں مختلف خاصیتوں کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ مراء اور جدال یعنی ہمت کرنا اور جھگڑنا کبھی اعراض کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی غرض دوسرے کا دعویٰ باطل کرنا ہوتا ہے۔ کبھی ہمت اور جھگڑا حق لینے کے لئے ہوتا ہے۔ اس وقت یہ جذب کی خاصیت کے ماتحت ہوتا ہے۔

غرض انسانی اخلاق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت مادہ کے خواص کی ایک ترقی یافتہ صورت ہیں اور صرف ارتقاء کی حالت میں غیر مادی صورت اختیار کر گئے ہیں اور بعض صورتوں میں مرکّب ہو گئے ہیں۔ اس اصل کے ماتحت جو مَیں نے اُوپر بیان کیا ہے نہ صرف یہ کہ اخلاق کی جڑ اور حقیقت ہی معلوم ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اخلاق کی برائی اور بھلائی ذاتی نہیں ہے بلکہ ان کے استعمال کی طرز اور موقع سے وابستہ ہے کیونکہ خاصیات اپنی ذات میں نہ بُری ہیں نہ اچھی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر اس تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا کو پیدا کرنے والی ایک ہستی ہے کیونکہ اخلاق کی ایسی گہری جڑ آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ابتدائے عالم سے اس امر کا خیال رکھنا کہ انسان کے دل میں اخلاق کی ایک گہری جڑ قائم کی جائے جس سے وہ آزاد ہو ہی نہ سکے بغیر کسی بالارادہ ہستی کے فعل کے نہیں ہو سکتا۔ اسی نے انسان کی پیدائش کی غرض کو مدنظر رکھ کر اس کے خمیر میں ہی اخلاق کی آمیزش کی تا وہ ہر حالت اور ہر عمر میں اخلاق کے اثر کو قبول کرنے کی قابلیت رکھے اور ان کی طرف اسے فطرتی مَیلان ہو۔

اعلیٰ اخلاق کا خیال کیوں رکھا جائے؟

اخلاق کی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد مَیں اِس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ

اعلیٰ اخلاق کیوں برتے جائیں اور بُرے اخلاق سے کیوں اجتناب کیا جائے؟

یورپ کے لوگ چونکہ فلسفۂ اشیاء کی طرف زیادہ متوجہ ہیں انہوں نے اِس سوال کو خاص اہمیت دی ہے اور ان میں سے محققین نے بڑے غور کے بعد اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اعلیٰ اخلاق اپنی ذات میں اچھی چیز ہیں اس لئے خود اعلیٰ اخلاق کی خاطر نہ کہ کسی اَور غرض سے ان کو قبول کرنا چاہئے۔

اسلامی ماہرین اخلاق نے اِس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان کو اخلاق کا اظہار بہ نیت ثواب کرنا چاہئے۔ اور امام غزالی یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کوئی صحت کے خراب ہونے کے خیال سے زنا سے بچے تو وہ متقی نہیں ہے۔

اِس خیال پر مغربی خیال کے دلدادہ دو اعتراض کرتے ہیں (۱) جو شخص کسی مریض کا علاج اس کی صحت کے خیال سے نہیں بلکہ ثواب کی خاطر سے کرتا ہے کیا وہ تاجر نہیں۔ پھر جو شخص تجارت کے طور پر ان کاموں کو کرتا ہے وہ کیوں اچھا سمجھا جائے۔ (۲) اگر کوئی شخص زنا سے اپنی حفاظت عزت یا صحت کے لئے بچے تو وہ کیوں عفیف نہیں ہے اور اگر عفیف نہیں ہے تو شریعت نے زنا سے منع کیوں کیا ہے؟ تم کہتے ہو چونکہ اس طرح زنا سے بچنے میں ثواب کی نیت نہیں اس لئے وہ اخلاق نہیں کہلا سکتے۔ ہم پوچھتے ہیں خدا کسی کام کا ثواب کیوں دیتا ہے، اسی لئے نا کہ جس کام کے متعلق وہ کہتا ہے یوں نہ کرو وہ نہ کیا جائے اور جس کام کے متعلق وہ کہے کرو وہ کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیوں کسی کام کے متعلق کہتا ہے کہ یہ کرو اور کیوں کہتا ہے کہ فلاں کام نہ کرو۔ اگر بغیر کسی حکمت کے تو اس کی شریعت بے معنی اور فضول ہوئی اور اگر کسی سبب سے اور حکمت کے ماتحت تو اس حکمت کو مدنظر رکھ کر کام کرنا کیوں اخلاق فاضلہ میں شامل نہ ہو گا۔ جس حکمت کو خدا تعالیٰ حکم دیتے وقت مدنظر رکھتا ہے اگر بندہ اسے کام کرتے وقت مدنظر رکھے تو اس کے کام کی قدر کیوں کم ہو جائے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے اگر زنا صحت یا قیام امن کے لئے منع فرمایا ہے تو جب ہم اسی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے زنا نہ کریں تو یہ کیوں اچھا خُلق نہ سمجھا جائے اور ہم کیوں ثواب کے مستحق نہ ہوں۔ اور اگر زنا سے منع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو معلوم ہوا خدا تعالیٰ نے اس کی ممانعت کا یونہی حکم دیا ہے۔

پہلے اعتراض یعنی تجارت کا جواب یہ ہے کہ اس فعل اور تجارت میں کوئی مناسبت نہیں کیونکہ اخلاق حسنہ کی جزاء خدا تعالیٰ نے پہلے مقرر کر رکھی ہے اور کہہ چھوڑا ہے کہ جو فلاں افعال

سے بچے گا اُسے یہ بدلہ دیا جائے گا اور جو فلاں افعال کرے گا اُسے یہ بدلہ دیا جائے گا۔ پس یہ تجارت نہیں بلکہ انعام ہے کیونکہ تجارت میں انسان اپنے کام کی قیمت خود مقرر کرتا ہے یہاں بدلہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے کا مقرر شدہ ہے اور طبعی بدلہ ہے۔ خواہ ہم خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت رکھیں یا نہ رکھیں وہ بدلہ ہمیں مل رہا ہے اور ملے گا پس یہ تجارت نہیں۔ تجارت تو یہ ہے کہ مثلاً ایک کے پاس گھی ہے اور دوسرے کے پاس روپیہ۔ وہ روپیہ دے کر گھی خرید لیتا ہے لیکن بیچنے والا مختار ہے خواہ اپنی چیز دے یا نہ دے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کیونکہ کام لینے والے نے خود ہی انعام کا وعدہ کیا ہے اور کام کرنے والے نے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ پھر یہ فرق ہے کہ وعدہ کرنے والا وہ ہے جس کے ہم بہرحال محتاج ہیں۔ اگر وہ افعال جنہیں ہم بہ نیت ثواب کرتے ہیں نہ بھی ہوں تب بھی اسی کے احسان سے جیتے ہیں۔ اس ایسے شخص کے انعام کو جس کے انعام کے بغیر ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے تجارت نہیں کہا جا سکتا تجارت اسی سے ہوتی ہے، جس سے ہم مستغنی ہوں خواہ تعلق رکھیں یا نہ رکھیں۔

دوسرا اعتراض بالکل ٹھیک ہے بشرطیکہ یہ کہا جائے کہ اگر بہ نیت ثواب کوئی کام نہ ہو تو وہ اخلاق سے نہیں۔ اصل جواب ان اعتراضوں کا یہ ہے کہ تم لوگ ثواب کی حقیقت کو نہیں سمجھے، ثواب کے معنے اگر روپیہ پیسہ کے ہوں تو بیشک تمہارا اعتراض درست ہو سکتا ہے، مگر ثواب کے معنے روپیہ اور پیسہ کے نہیں ہیں بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے حاصل ہونے کے ہیں جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہم کامل الصفات ہو جائیں۔ ہمارے اندر وہ طاقت پیدا ہو جائے جس سے پاکیزگی ہمارا ذاتی جوہر ہو جائے اور ہم طہارت کا سرچشمہ ہو جائیں۔ جو انعامات کہ بظاہر مادی معلوم ہوتے ہیں وہ یا تو استعارے ہیں اور یا پھر اصل مقصد نہیں بلکہ لوازمات سے ہیں، اور لوازمات اصل مقصد نہیں ہوتے۔ ایک دوست کی انسان خاطر کرتا ہے، وہ خاطر اصل نہیں بلکہ لازمہ ہے، اصل دلی میلان اور اندرونی اتصال ہے۔ اسی طرح ثواب سے مراد کھانا اور پینا نہیں بلکہ کمال ذاتی کا حصول ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنی انسانی پیدائش کی غرض عبد بننا ہے۔ پس ثواب یہ ہے کہ انسان کو عبد بننے کی توفیق عطا ہو اور وہ کامل ہو جائے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اس غرض سے کام کرنے سے ہی اخلاق اخلاق کہلا سکتے ہیں ورنہ وہ صرف ظاہری مشقیں ہیں اور کچھ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص ظاہری اخلاق کے مطابق عمل کریگا وہ دُنیا میں ایک حد تک فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اگر

اس کی غرض ساتھ ہی کامل ہونے کی نہیں اور خدا کی رضا کی اسے جستجو نہیں تو کمال اُسے کس طرح حاصل ہو گا۔ باطنی اور ذہنی افعال کا دارومدار تو نیتوں پر بہت ہی مبنی ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جسمانی افعال بھی نیتوں سے وابستہ ہیں۔ ورزش کرتے وقت اگر جسم کی طاقت کا خیال رکھا جائے تو اعلیٰ نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور اگر نہ رکھا جائے تو ادنیٰ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم رضائے الٰہی کے لئے اخلاق پر عمل کرتے ہیں اور رضائے الٰہی کے حصول سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں کچھ آئندہ دے بلکہ یہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے کا شکر ادا کریں۔ اور اخلاقی طور پر اس کے حضور سرخرو ٹھہریں۔

علاوہ ازیں مَیں کہتا ہوں معترض خود اپنی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اگر انعام کا مل جانا خود غرضی ہے تو اس کے اندر بھی خود غرضی موجود ہے۔ ہم اس سے دریافت کرتے ہیں کہ بیمار کا علاج کوئی شخص کیوں کرتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ دلی رحم کی وجہ سے، تو پھر یہ خوبی نہ رہی کیونکہ اگر اسے دل مجبور کرتا ہے کہ ضرور علاج کرو تو پھر علاج کرنے والے کی یہ خوبی نہیں وہ تو اپنے دل سے مجبور ہو کر کر رہا ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی اَور وجہ ہو گی اور وہ تعاون کا خیال ہے۔ انسان سمجھتا ہے آج مَیں کسی کا علاج کرونگا تو کل میرا بھی کوئی کریگا۔ اس میں بھی اس کام کا بدلہ ملنے کا خیال ہو گیا۔ اس کے مقابل پر ہماری طرف دیکھو کہ ہم یہ نیت نہیں رکھتے کہ جو ہم کام کرتے ہیں ان کا بدلہ روپے پیسہ کی شکل میں ہمیں آئندہ ملے۔ بلکہ یہ نیت کرتے ہیں کہ ہم اس پہلے انعام کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو ہمیں اس وقت تک خدا تعالیٰ کی طرف سے مل چکا ہے۔

بااخلاق کسے کہتے ہیں؟

اَب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ بااخلاق کسے کہتے ہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک جس میں سب خوبیاں ہوں اور جو سب عیبوں سے پاک ہو وہ بااخلاق ہوتا ہے۔ باقی مذاہب والے بھی تھوڑے بہت اسی طرف گئے ہیں۔ مگر اسلام کہتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ [۱۹] کہ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں وہ اچھے اخلاق والا ہے اور جس کی بدیاں زیادہ ہوں وہ بداخلاق ہے۔ دیگر مذاہب والے کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص ساری عمر نیکیاں کرتا رہے اور ایک بدی کا مرتکب ہو جائے تو بداخلاق ہو گا۔ لیکن اسلام کہتا ہے جو شخص کوشش کر کے کثرت کے ساتھ خوبیاں پیدا کر لیتا ہے اس میں اگر بعض عیوب بھی ہوں جن کو خوبیاں چھپا لیں تو وہ بااخلاق ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دیگر مذاہب والے سمجھتے ہیں کہ شریعت تحکّم ہے اس کے احکام کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لئے ذرا کوئی حکم توڑا اور انسان پکڑا گیا گویا شریعت تعزیرات کے طور پر ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے اخلاق اور شریعت کے احکام اپنی ذات میں مقصود نہیں بلکہ یہ تو ورزشیں ہیں جو انسان میں دلی پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے ہیں اِن کے ذریعہ مشق کرائی جاتی ہے تا کہ پاکیزگی پیدا ہو اس لئے اگر کسی مشق میں کوئی غلطی ہو جائے تو یہ نہیں کہ ضرور اس کی سزا دی جائے تاوقتیکہ اس غلطی سے مشق کی اصل غرض کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور اصل مقصد فوت نہ ہو جاتا ہو۔ جیسے مثلاً سکول میں اگر کوئی لڑکا دس سوالوں میں سے ایک درست نہ نکالے تو اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح ڈاکٹر غلطیاں بھی کرتے ہیں لیکن اگر ان کے علاج سے لوگوں کو صحت ہو تو وہ ڈاکٹر سمجھے جاتے ہیں۔ پس اگر کسی میں بعض نقص رہ بھی جائیں تو بھی وہ بااخلاق سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کہے اچھائیں اور کوئی بُرائی نہیں کروں گا صرف چوری کر لیا کرونگا اس ایک نقص کا تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بغاوت ہے اور بغاوت معاف نہیں ہوا کرتی۔ معاف غلطی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک طالب علم کہے کہ مَیں ایک سوال کا جواب نہیں دوں گا تو اسے سکول سے نکالا جائے گا کیونکہ اس نے ممتحن کی ہتک کی۔ لیکن اگر وہ ایک آدھ سوال حل نہ کر سکے تو اس وجہ سے اسے کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

کیا اخلاق کی اصلاح ممکن ہے

اَب یہ سوال ہے کہ کیا اخلاق کی اصلاح بھی ممکن ہے گو عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے مگر اپنے معاملہ میں آکر کہدیا کرتے ہیں کہ کچھ نہیں بنتا۔ اسی مجمع میں جس سے پوچھو کہ اخلاق درست ہو سکتے ہیں تو کہے گا ہاں ضرور ہو سکتے ہیں اور اگر کہو تم نے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لی ہے تو کہے گا میں نے بہت زور لگایا ہے مگر کچھ نہیں بنتا۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کے لئے بُری رائے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے لئے اچھی۔ مگر اس معاملہ میں اُلٹ ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں کے لئے اچھی رائے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے لئے بُری۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ فرماتا ہے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى [20] اِنْ کے معنے قَدْ کے ہیں۔ کہ اے محمد ﷺ تو لوگوں کو نصیحت کر کہ نصیحت ہمیشہ ہی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پس قرآن کریم کی اس آیت کے ماتحت اخلاق کی اصلاح ہر حالت میں ہو سکتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بارے میں جو ارشاد جماعت کو کیا ہے وہ اپنی

ذات میں ایک معجزہ ہے بلکہ اتنا بڑا معجزہ ہے کہ وہی آپ کی صداقت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ قرآن کریم کو چھوڑ کر کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم کا وہی منبع ہے اور کسی نے اِس حقیقت کو بیان نہیں کیا۔ آپ نے ایسے الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ دل کو اُمید سے پُر کر دیتے ہیں۔ آپ جماعت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

"یہ خیال نہ کرو کہ ہم گنہگار ہیں ہماری دُعا کیونکر قبول ہو گی۔ انسان خطا کرتا ہے مگر دعا کے ساتھ آخر نفس پر غالب آجاتا ہے اور نفس کو پامال کر دیتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر یہ قوت بھی فطرتاً رکھ دی ہے کہ وہ نفس پر غالب آجائے۔ دیکھو پانی کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ آگ کو بجھا دے۔ پس پانی کو کیسا ہی گرم کرو اور آگ کی طرح کر دو پھر بھی جب وہ آگ پر پڑے گا تو ضرور ہے کہ آگ کو بجھا دے جیسا کہ پانی کی فطرت میں برودت ہے ایسا ہی انسان کی فطرت میں پاکیزگی ہے۔ ہر ایک شخص میں خدا تعالیٰ نے پاکیزگی کا مادہ رکھ دیا ہوا ہے۔ اس سے مت گھبراؤ کہ ہم گناہ میں ملوّث ہیں۔ گناہ اس میل کی طرح ہے جو کپڑے پر ہوتی ہے اور دُور کی جا سکتی ہے۔ تمہارے طبائع کیسے ہی جذبات نفسانی کے ماتحت ہوں خدا تعالیٰ سے رو رو کر دُعا کرتے رہو تو وہ ضائع نہ کرے گا۔ وہ حلیم ہے، وہ غَفُوْرٌ رَّحِیْم ہے"۔[21]

یہ ایسا پُر اُمید پیغام ہے کہ گو اجمالی طور پر قرآن کریم میں پایا جاتا ہے مگر اَور کسی کتاب میں اس کو اس رنگ میں نہیں بیان کیا۔ جس رنگ میں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اجمال کے طور پر قرآن کریم سے اس بیش بہا تعلیم کو لیا ہے اور کسی کتاب نے بیان نہیں کیا۔ اور تشریح کو مدنظر رکھا جائے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کمال کر دیا ہے۔

اُوپر کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں ایسا مادہ ہے کہ جب بھی اس کو کام میں لایا جائے سب گناہوں کو دُور کر دیتا ہے اور اصلاح کر دیتا ہے۔

فطرت کا میلان نیکی کی طرف ہے یا بدی کی طرف

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پھر فطرت کا میلان نیکی کی طرف ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فطرت کا میلان نہ نیکی کی طرف ہے نہ بدی کی طرف۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیتیں دیکر بھیجا ہے اور اسے مقدرت دی ہے کہ وہ انہیں نیک و بد طور پر استعمال کر سکے۔ پھر وہ اسے سیدھا راستہ دکھا کر چھوڑ دیتا ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ [۴۲] یعنی ہم نے انسان کو ہر رنگ کی طاقت دیکر قدرت دیدی ہے۔ چاہے کافر بنے چاہے شکر گزار۔

دُنیا میں اکثر بدی کیوں ہے؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان میں یہ طاقت ہے کہ بدی کو دبا سکتا ہے تو دُنیا میں بدی کیوں زیادہ ہے اور نیکی کیوں کم ہے؟

اِس سوال کا جواب مَیں نے پہلے بھی اپنی ایک تقریر میں دیا تھا۔ مگر پچھلے دنوں چار پانچ آدمیوں نے مختلف مقامات سے یہ سوال لکھ کر بھیجا ہے۔ نہ معلوم ایک ہی وقت میں یہ سوال کس طرح پیدا ہو گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دُنیا میں بُرائی زیادہ نہیں بلکہ نیکی زیادہ ہے۔ دیکھو ایک چور جس میں چوری کی بُرائی پائی جاتی ہے وہ اگر کئی نیک کام کرے۔ مثلاً خوش خُلق ہو، سخی ہو، ماں باپ کی خدمت کرنے والا ہو تو اس میں نیک خُلق زیادہ ہوئے یا بُرے؟ پس اخلاق کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ بداخلاقی کم ہو گی اور نیک اخلاق زیادہ ہونگے۔ اکثر نیک اخلاق لوگوں میں پائے جائیں گے اور بداخلاقیاں کم ہوں گی۔ یہ شبہ کہ دُنیا میں بُرائیاں بہ نسبت نیکیوں کے زیادہ ہیں دو وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اِس وجہ سے کہ لوگ دیکھتے ہیں دُنیا میں کافر زیادہ ہوتے ہیں اور مؤمن کم۔ اور دوسرے اس وجہ سے کہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اکثر انسانوں میں کچھ عیوب نظر آتے ہیں لیکن یہ دونوں اُمور ہرگز ثابت نہیں کرتے کہ دُنیا میں بدی زیادہ ہے بلکہ باوجود اِن دونوں اُمور کے دُنیا میں نیکی زیادہ ہے۔ اگر پہلی بات کو یعنی اس امر کو کہ دُنیا میں کافر زیادہ ہیں لیا جائے تو غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ ایک دھوکا ہے جو حقیقت پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ حقیقت یہ نہیں کہ دُنیا میں کافر زیادہ ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں کافر کہلانے والے زیادہ ہیں کیونکہ اگر تحقیق کی جائے تو دُنیا میں سے اکثر آدمی وہی ملیں گے جن پر باطنی حجت پوری نہیں ہوئی۔ پس گو ان کا نام ظاہر شریعت کی بناء پر کافر رکھا جائے خدا تعالیٰ کے نزدیک ان میں کفر کی حقیقت نہیں پائی جاتی بلکہ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ یا پھر موقع دیگا یا ان کے فطری اعمال یعنی شرک و توحید کی بناء پر انہیں سزا یا جزاء دیگا۔ پس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اصل میں ایمان ہی زیادہ ہے اور اسی نسبت سے نیکی بدی کی نسبت زیادہ ہے۔

دوسری وجہ بھی کہ اکثر لوگوں میں کمزوریاں نظر آتی ہیں باطل ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ

اکثر لوگوں میں کمزوریاں نظر آتی ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اکثر لوگوں میں بدیاں نظر آتی ہیں یا نیکیاں اگر اکثر لوگوں میں اکثر نیکیاں نظر آتی ہیں تو نیکی دُنیا میں زیادہ ہوئی۔ اور ہر شخص جو انسانوں کے مجموعی اعمال پر نظر کریگا اسے معلوم ہو گا کہ انسانوں کے اعمال کو مجموعی طور پر دیکھ کر یہی ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں اکثر نیکیاں ہیں اور کم بدیاں ہیں۔ پس دُنیا میں بدی کم ہوئی اور نیکی زیادہ۔

بعض لوگ اِس موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ خواہ کچھ ہو اگر اکثر لوگوں کو سزا ملنی ہے تو پھر شیطان جیتا۔ مَیں کہتا ہوں نہیں، پھر بھی خدا ہی جیتا اور وہ اس طرح کہ خدا تعالیٰ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ سزا بُھگت کر سارے کے سارے انسان جنت میں چلے جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے۔ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ مَیں نے انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے بندے بن جائیں۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ لوگ خدا کے بندے بن کر بھی سزا میں پڑے ہیں پس معلوم ہوا کہ ایک وقت سب کے سب دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ چنانچہ دوسری آیات اور احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت سب کے سب لوگ جنت میں چلے جائیں گے۔ اس لئے سارے خدا کے عبد ہو گئے اور خدا ہی جیتا۔ پھر شیطان بھی کہاں بیٹھا رہے گا، وہ بھی جنت میں چلا جائے گا۔ اس طرح وہ اپنے نفس کے لحاظ سے بھی ہار گیا۔ اب وہ جو کہتے ہیں شیطان جیتا وہ شیطان کو بھی جنت میں دیکھ کر شرمائیں گے کہ ہم تو اسے جتا رہے تھے یہ خود بھی یہیں آگیا۔

اب پھر مَیں باکمال انسان کی تعریف دُہراتا ہوں۔ باکمال وہ انسان ہے جو اِس حد تک گناہ سے بچے کہ اس کی روح ہلاکت اُخروی سے بچ جائے۔ (ہلاکت اُخروی سے مراد خدا تعالیٰ کی ناراضی ہے) اور اِس حد تک نیکی کرے کہ خدا تعالیٰ کی رضاء کی طرف قدم مارنے کی فوری قوت اس میں پیدا ہو جائے۔ ورنہ یوں تو یہ قوت سب میں پیدا ہو گی۔

گناہ کیا ہے؟

اَب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ گناہ کیا ہے۔ گناہ وہ عمل ہے کہ جس سے انسان کی روح بیمار ہو جاتی ہے اور رؤیت الٰہی کے قابل نہیں رہتی اور اس کے لئے اس سفر میں دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ ان اعمال میں سے بعض مادی ہیں اور بعض روحانی۔ جو مادی ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ جن کی مضرّات نظر آتی ہیں۔ جیسے جھوٹ، قتل وغیرہ کے ارتکاب کا نقصان عیاں ہوتا ہے۔

نیکی کیا ہے؟

نیکی وہ اعمال ہیں کہ جن سے انسانی روح کو اتنی صحت حاصل ہو جائے کہ وہ رؤیت الٰہی کے قابل ہو جائے۔ تندرست آدمی کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کام کاج کر سکے۔ ورنہ ڈاکٹر تو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بیماری بتا دے گا۔ پس نیکی یہ ہے کہ رؤیت الٰہی کی قابلیت انسان میں پیدا ہو جائے۔ اس میں بھی روحانی اور مادی دونوں قسم کے افعال شامل ہیں۔

گناہ کی اقسام

اصل مضمون کے سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھنی بھی ضروری ہے کہ گناہ کی اقسام کتنی ہیں۔ سو یاد رکھو کہ اس کی تین اقسام ہیں (۱) دل کا گناہ۔ یہ اصل گناہ ہے۔ (۲) زبان کا گناہ۔ (۳) جوارح یعنی ہاتھ اور پاؤں اور دیگر اعضاء کا گناہ۔

نیکی کی کتنی اقسام ہیں

نیکی کی اقسام بھی تین ہی ہیں (۱) دل کی نیکی۔ یہ اصل ہے (۲) زبان کی نیکی (۳) جوارح کی نیکی۔

نیکی کی اِسقدر طاقتوں کی موجودگی میں گناہ کہاں سے آتا ہے؟

اُوپر کے بیان کو پڑھ کر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جب بندہ کی ترقی کے لئے خدا تعالیٰ نے اسقدر طاقتیں رکھی ہیں تو گناہ کہاں سے آتا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی ابتداء مندرجہ ذیل امور سے ہوتی ہے جہالت یا عدم علم سے۔ یعنی بعض دفعہ انسان طبعی تقاضوں کے پورا کرنے میں قوت فکر سے کام نہیں لیتا اور عارضی خوشی کو مقدم کر لیتا ہے۔ پس عارضی خوشی دائمی راحت سے اس کی نظر کو ہٹا دیتی ہے۔ اس کے موجبات یہ ہیں۔

اول جہالت مستقل ہو یا عارضی۔ جہالت مستقل تو ظاہر ہی ہے عارضی جہالت یعنی باوجود علم کے ایک وقت میں جاہل کی طرح ہو جائے۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔ (۱) لالچ۔ اس سے بھی جہالت پیدا ہوتی ہے (۲) غصہ (۳) سخت ضرورت (۴) صحت کی خرابی (۵) سخت خوف (۶) سخت محبت۔ اس سے بھی جہالت پیدا ہوتی ہے (۷) انتہائی اُمید (۸) سخت مایوسی (۹) ضد (۱۰) خواہش کی زیادتی (۱۱) خواہش کی کمی (۱۲) ورثہ یعنی بعض خیالات ورثہ سے ملتے ہیں اور بسا اوقات دوسرے تمام خیالات پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ بارہ ذریعے ہیں جن سے جہالت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) دوسری چیز جس سے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ صحبت کا اثر ہے۔ انسان کے اندر نقل کی طاقت رکھی گئی ہے۔ وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور

نہیں کرتا۔ صحبت کا اثر زیادہ تر ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے، کھیلنے والوں کی طرف سے اور اُستادوں کی طرف سے پڑتا ہے۔ قومی رسوم سے جو اثر انسان پر پڑتا ہے وہ بھی اسی قسم میں شامل ہے۔

(۳) گناہ کا ایک موجب غلط علم بھی ہے۔ ایسی باتوں کو انسان علم سمجھ لیتا ہے جو علم نہیں ہوتیں۔ ایسے اُصول پر عمل کرتا ہے جو غلط ہوتے ہیں۔

(۴) گناہ کا ایک موجب عادت بھی ہے۔ باوجود اس کے کہ انسان سچائی سے واقف ہوتا ہے مگر جب موقع آتا ہے اس برائی سے بچ نہیں سکتا۔ مثلاً جانتا ہے کہ شراب پینا بُرا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ نہیں پیوں گا۔ لیکن باہر جاتا ہے، بادل آیا ہوتا ہے، ایک ایسی صحبت میں جا کر بیٹھتا ہے جہاں شراب اُڑ رہی ہے وہاں دوسرے کہتے ہیں لو تم بھی پیو تو اس نے نہ پینے کے متعلق جو ارادہ کیا تھا وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(۵) گناہ کا ایک موجب سُستی اور غفلت ہے۔ ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ عادت بھی نہیں ہوتی۔ مگر باوجود اس کے کام کرنے کی امنگ نہیں ہوتی۔ کہتا ہے پھر کرلیں گے۔ اسی میں وقت گزر جاتا ہے اور وہ بُرائی میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے وقت ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ایک مخلص صحابی تھے جو جنگ کے لئے جانے کی تیاری کرنے کی بجائے اس خیال سے بیٹھے رہے کہ جب چاہوں گا چل پڑوں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لشکر کے ساتھ نہ جا سکے۔[۲۳] غرض کبھی سستی سے بھی انسان گناہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کے اندر یہ مادہ نہیں ہوتا کہ اُسے مجبور کرے کہ اُٹھو یہ کام کرو۔

(۶) گناہ کا ایک موجب عدمِ موازنہ بھی ہے۔ یعنی یہ فیصلہ کرنے کی طاقت نہ رکھنا کہ یہ کام اچھا ہے یا وہ۔ یا یہ کہ فلاں جذبہ کو کس حد تک کس سے اور کس حد تک کس سے استعمال کرنا چاہئے۔ مثلاً محبت ایک اچھا جذبہ ہے لیکن ایک شخص بیوی سے زیادہ محبت کرے اور ماں سے کم حالانکہ ماں کا اس پر احسان ہے۔ وہ اس کے عدم سے وجود میں لانے کا باعث ہوئی ہے اور بیوی سے اس کا تعاون کا رشتہ ہے وہ صرف اس کی خواہشات کو پورا کرتی ہے یا جیسے آجکل بعض لوگ کہتے ہیں حضرت مرزا صاحب سچے ہیں مگر ہم فلاں پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے ہیں۔ یہ سب باتیں قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

(۷) گناہ کا ایک موجب اس زمانہ کے خیالات کی مخفی رَو بھی ہے۔ باقی اُمور کی مَیں نے

تفصیل نہیں بیان کی مگر اس کی بیان کروں گا۔ کیونکہ تفصیل کے بغیر آپ لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔

بِلا اس کے کہ کوئی تحریک کرے یا منوانے کے لئے دلیل دے۔ جب کسی خیال کی رَو دُنیا میں چلے گی تو وہ متاثر کرے گا۔ دس بدمعاشوں میں ایک اچھے انسان کو بٹھادو، وہ بدمعاش خواہ دل میں بدی رکھیں اور اس پر ظاہر نہ کریں تو بھی اس کے دل پر بُرائی کا اثر ہونا شروع ہو جائے گا۔ ایک دفعہ ایک سکھ لڑکا جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اخلاص تھا، اس نے حضرت خلیفہ اول کی معرفت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیغام بھیجا کہ میرے دل میں کچھ دنوں سے دہریت کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ جب حضرت خلیفہ اول نے یہ بات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنائی تو آپ نے فرمایا اسے کہو کالج میں جہاں اس کی سیٹ ہے اُسے بدل لے۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور بعد میں پتہ لگا جس دن سے اُس نے سیٹ تبدیل کی اُسی دن سے اس کے خیالات میں اصلاح ہونی شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں دہریت کے خیالات پیدا ہونے کا سبب ایک دہریہ لڑکے کا قُرب تھا۔ بغیر اس کے کہ وہ لڑکا اپنے خیالات کو ظاہر کرتا اس کے دلی خیالات کا اثر اُس سکھ لڑکے پر پڑتا رہتا تھا۔

پس خیالات کی رَو ایسی چیز ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ اس کی مثال حیوانوں میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دو بلّیاں آپس میں لڑنے لگتی ہیں لیکن تھوڑی دیر غوں غوں کرنے کے بعد ان میں سے ایک اپنی دُم نیچی کر کے چلی جاتی ہے اور لڑائی نہیں ہوتی۔

اِسی طرح شیروں کے متعلق تجربہ کیا گیا ہے۔ چار پانچ کو اکٹھا ایک جگہ چھوڑ دیا جائے تو ان میں سے جو سب سے زبردست ہو گا وہ کھڑا رہے گا اور باقی اپنی دُمیں نیچی کر کے اِدھر اُدھر سرک جائیں گے۔ اس وقت اگر ان کے درمیان گوشت ڈالا جائے تو صرف وہی کھائے گا جو زبردست ہو گا۔ اور باقی بغیر پنجہ مارے چُپکے کھڑے رہیں گے۔

مسمریزم جو خیالات کی رَو سے ہی متأثر کرنے والا علم ہے اس کے متعلق مَیں ایک دفعہ تجربہ کر رہا تھا تاکہ اس علم کے ذریعہ روحانیت پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان کا جواب دیا جا سکے۔ اس وقت ہماری نانی اماں صاحبہ نے کہا۔ یہ یونہی باتیں ہیں یہ سامنے چڑیا بیٹھی ہے اسے پکڑ کر دکھا دو تو جانیں۔ چڑیا دو اڑھائی گز کے فاصلہ پر بیٹھی تھی۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے

متأثر کیا اور اُس کے پاس چلا گیا۔ لیکن جب مَیں نے اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو چونکہ میرا ہاتھ میری اور اُس کی آنکھوں کے درمیان آگیا اس لئے وہ ہاتھ سے نکل کر اُڑ گئی۔

ایک سیاح لکھتا ہے۔ مَیں نے جنگل میں دیکھا کہ ایک گلہری بے تحاشا دوڑ رہی ہے مگر دُور نہیں جاتی۔ ہِر پھر کر اسی جگہ آجاتی ہے۔ مَیں نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سانپ سر نکالے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ آخر وہ بالکل اس کے نزدیک چلی گئی اور سانپ اُسے منہ میں ڈالنے ہی والا تھا کہ مَیں نے اُسے کوڑا مارا اور وہ بھاگ گیا۔ یہ سانپ کے خیالات کا ہی اثر تھا کہ وہ گلہری بھاگ کر دُور نہ جاسکتی تھی اور آخر بالکل قریب آگئی۔

ایک اَور سیاح لکھتا ہے۔ افریقہ کے ایک جنگل میں مَیں نے دیکھا کہ ایک پرندہ پھڑپھڑا رہا ہے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانپ اس کی طرف نظر جمائے بیٹھا ہے۔ میں نے سانپ کو مار دیا۔ بعد میں دیکھا تو وہ جانور بھی اس خوف اور صدمہ سے کہ مَیں پکڑا جاؤنگا، مرا پڑا تھا۔

انگلستان میں ایک اَور طریق سے تجربہ کیا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جنس کے دو کیڑے لائے گئے۔ ان میں سے ایک پانچ میل کے فاصلہ پر رکھ دیا گیا مگر وہ دوسرے کیڑے کے پاس خود بخود پہنچ گیا۔ یہ خیالات کی رَو کا ہی نتیجہ تھا۔

امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے چیونٹیوں کا گھر بنایا جسے چاروں طرف سے بند کر دیا۔ اس کے بعد دیکھا گیا کہ باہر کی طرف سے چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ جب اس کمرہ کو کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ اسی جگہ چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں جس طرف چیونٹیوں کا گھر تھا۔ پھر اسے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا گیا اور چیونٹیاں ادھر ہی جا چمٹیں، حالانکہ درمیان میں دیوار حائل تھی۔

اِن واقعات سے ثابت ہے کہ خیالات کی رَو ایک زبردست طاقت ہے۔ رسول کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے کہ جب آپ کسی مجلس میں بیٹھتے تو ستّر بار استغفار پڑھتے۔[۲۴] اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ڈرتے تھے کہ آپ گندے نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ نبی گندگی کے پاس آنا بھی پسند نہیں کرتے اس لئے آپ بھی استغفار پڑھتے تھے کہ گندگی دُور ہی رہے۔ پھر بعض لوگ ایسے بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جو خود گندے نہیں ہوتے مگر دوسروں کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ پس آپ اس لئے بھی استغفار پڑھتے تھے کہ ان پر کسی گندگی کا اثر نہ ہو۔

گناہ آلود حالتیں

گناہ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے گناہ آلود حالتوں کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے اس لئے اب میں گناہ آلود حالتوں کا بھی اِس جگہ ذکر کر دیتا ہوں۔

پہلی حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر کبھی کبھی اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ گناہ کو بُرا تو سمجھتا ہے مگر اکثر لالچوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور گناہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو بُرا تو نہیں سمجھتا مگر گناہ کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر موقع پیش آجائے تو گناہ سے نفرت بھی نہیں کرتا۔

چوتھی حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو پسند کرتا ہے مگر اس میں حیا کا مادہ ہوتا ہے اِس لئے پوشیدہ گناہ کرتا ہے۔ اور اگر گناہ سے رُکتا ہے تو عادت یا رسم کی وجہ سے رُکتا ہے۔

پانچویں حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان عادت اور رسم کو توڑ کر گناہ کے ارتکاب پر دلیر ہو جاتا ہے اور گناہ کو پسند کرتا ہے۔

چھٹی حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کو بدی کی ترغیب دیتا اور اسے اچھا قرار دیتا ہے۔

ساتویں حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان شیطان کا بروز ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد ہی بدی پھیلانا ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں نیکی کی یہ حالتیں ہیں۔

اول۔ بخواہشِ ثواب نیکی کرنا۔ دوم۔ بطور فرض نیکی کرنا کہ خدا کا حکم ہے۔ سوم۔ نیکی کو نیکی کی خاطر کرنا۔ چہارم۔ نیکی کو بطور عادت کرنا۔ پنجم۔ نیکی میں ہی اپنی خوشی پانا۔ ششم۔ دُنیا میں نیکی پھیلانے کی کوشش کرنا۔ ہفتم۔ نیکی کا مجسم ہو جانا اور نیکی کے پھیلانے کو اپنا مقصدِ وحید قرار دے لینا۔ یعنی ملائکہ کی طرح ہو جانا۔

اس کے اُوپر اَور بھی درجے ہیں۔ مگر وہ کسبی نہیں بلکہ وہبی ہیں۔ یعنی نبوت کے مدارج۔

مَیں اُوپر بتا آیا ہوں کہ اخلاق اور روحانیت میں صرف اس قدر فرق ہے کہ وہی صفات جب بندوں کے متعلق استعمال ہوں تو اخلاق کہلاتی ہیں۔ اور جب خدا تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوں تو روحانیت۔ اس لئے جو اصولی علاج ایک کا ہو گا وہی دوسرے کا۔ اس لئے مجھے اخلاقی اور روحانی

بیماریوں کے علاج الگ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مَیں اس جگہ ان علاجوں کے بیان کرنے کی گنجائش پاتا ہوں جو دوسرے مذاہب نے بیان کئے ہیں یا صوفیاء نے بیان کئے ہیں اس لئے مَیں اُوپر کی ابتدائی تشریحوں کے بعد گناہ کے علاج کے متعلق وہ اسلامی تعلیم جو میری سمجھ میں آئی ہے بیان کرتا ہوں۔

اسلام نے علاجِ گناہ کے متعلق گناہ پیدا ہونے کے بعد، اس کا علاج کس طرح کیا جائے؟ کے سوال سے پہلے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا احتیاط کی جائے کہ گناہ پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سوال کے جواب میں گناہ کے دُور کرنے کی کنجی ہے۔ کپڑے کے میلا ہو جانے کے بعد اس کے دھونے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ایسی تدبیر اختیار کریں کہ وہ مَیلا ہی نہ ہو۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ سب سے بہتر اور ضروری امر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دوسرے مذاہب کے برخلاف صرف اسی طرف توجہ نہیں دلائی کہ گناہ کا قلع قمع کس طرح کیا جائے، بلکہ اِس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرو کہ گناہ پیدا ہی نہ ہو۔

مگر مَیں افسوس سے کہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے ادھر توجہ دلائی اور بعض اسلامی بزرگوں نے بھی اس پر زور دیا ہے، بحیثیت قوم مسلمانوں نے ادھر پوری توجہ نہیں کی اور اِس امر کو نظر انداز کر دیا ہے کہ گناہ انسان کے بلوغ سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں اب گناہ کرنے لگا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا بیج جو اس کے اندر تھا وہ درخت بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ ورنہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بیج نہ ہو اور درخت پیدا ہو جائے؟ ہرگز نہیں۔ اگر گناہ کی قابلیت پہلے ہی نہ تھی تو پھر وہ بالغ ہونے پر کہاں سے آگئی۔ پس اصل بات یہ ہے کہ گناہ بچپن سے پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک بدی بلوغ سے پہلے انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے، بلکہ بعض دفعہ تو پیدا ہونے سے بھی پہلے بعض بدیوں کی ابتداء شروع ہو جاتی ہے۔ جب ایک شخص بالغ ہو جاتا ہے اور علماء کہتے ہیں اسے بدیوں سے بچاؤ، تو اس وقت وہ شخص پورے طور پر شیطان کے قبضہ میں جا چکا ہوتا ہے۔ میرے اِس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں سب بدیاں پائی جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ اس میں گناہ کی طاقت اور ان کا شکار ہو جانے کا میلان پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اخلاق مادہ کی چند خاصیتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہی میلان اگر بچپن میں خراب ہو جائیں تو گو بچّہ بالکل بے گناہ نظر آئے، مگر اس کے اندر گناہ کے ارتکاب کا پورا سامان موجود ہو گا۔

اب ذرا سوچو تو سہی کہ گناہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا گناہ ورثہ سے نہیں پیدا ہوتے؟ وہ قومیں جو کوئی خاص کام کرنے والی ہوتی ہیں اسی قسم کا میلان ان کی اولاد میں پایا جاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جس میں نسلاً بعد نسلٍ بہادری کی روح نہ ہو اور اُسے بہادر بنانے کی کوشش کی جائے وہ لڑائی کے وقت ضرور بزدلی دکھائے گی۔ یا ویسی بہادری نہیں اس سے ظاہر ہو گی جیسی کہ ایک نسلی بہادر قوم سے ظاہر ہو گی۔ تو گو اس قسم کی باتوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، مگر پھر بھی ورثہ کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

اِسی طرح گناہ لالچ، غصہ، ڈر، محبت، خواہش کی زیادتی وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب غور کرو کیا یہ وہی خصلتیں نہیں جو بچپن میں ہی بچہ سیکھتا ہے۔ کیا وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر نظر آنے والی عادتیں ہی نہیں ہیں جو سارے گناہوں کا موجب ہوتی ہیں۔ ماں باپ کہتے ہیں کہ جی بچہ ہے۔ اِس لئے فلاں فلاں فعل کرتا ہے۔ مگر کیا بچپن ہی کا زمانہ وہ زمانہ نہیں ہے جب سب سے زیادہ گہری جگہ پکڑنے والے نقش جمتے ہیں۔ ایک شخص جو کسی کا مال چوری کر کے لے جاتا ہے اسے اگر بچپن میں اپنے نفس پر قابو کرنا سکھایا جاتا تو وہ بڑا ہو کر چوری کا کیوں مرتکب ہوتا۔ ایک شخص جہاد کے لئے جاتا ہے مگر دشمن سے ڈر کر بھاگ آتا ہے لوگ کہتے ہیں کیسا خبیث ہے۔ مگر غور کرو کیا اُسے وہی بزدلی پیدا کرنے والے قصے نہیں بھگالائے جو ماں اُسے بچپن میں سنایا کرتی تھی۔

اِسی طرح غصہ ہے۔ بچپن میں ماں باپ خیال نہیں رکھتے اس وجہ سے بچہ بڑا ہو کر ہر ایک سے لڑتا پھرتا ہے۔

پھر کیا گناہ قوت ارادی کی کمی سے پیدا نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ کمی کسی سبب کے بغیر ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر وجہ کیا ہے کہ انسان ساری عمر ارادے کر کر کے توڑتا رہتا ہے مگر اس سے کچھ نہیں بنتا؟ یہ ارادہ کی کمی ایک ہی دن میں تو نہیں پیدا ہو جاتی۔ بلکہ یہ بھی بچپن میں اور صرف بچپن میں پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ باوجود سچی خواہش کے کہ مَیں فلاں بدی کو چھوڑ دوں یہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر تربیت خراب نہ ہوتی تو انسان کی اصلاح کے لئے صرف اس قدر کہہ دینا کافی تھا کہ فلاں بات بُری ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا۔ اور وہ بات اچھی ہے اور وہ اسے اختیار کر لیتا۔

اَب مَیں اس نقص سے اولاد کو محفوظ کرنے کا طریق بتاتا ہوں۔ پہلا دروازہ جو انسان کے اندر گناہ کا کھلتا ہے وہ ماں باپ کے اُن خیالات کا اثر ہے جو اُس کی پیدائش سے پہلے اُن کے دلوں میں موجزن تھے۔ اور اس دروازہ کا بند کرنا پہلے ضروری ہے۔ پس چاہئے کہ اپنی اولادوں پر رحم کر

کے لوگ اپنے خیالات کو پاکیزہ بنائیں۔ لیکن اگر ہر وقت پاکیزہ نہ رکھ سکیں تو اسلام کے بتائے ہوئے علاج پر عمل کریں تا اولاد ہی ایک حد تک محفوظ رہے۔ اسلام ورثہ میں ملنے والے گناہ کا یہ علاج بتاتا ہے کہ جب مرد و عورت ہم صحبت ہوں تو یہ دُعا پڑھیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَ جَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا [۲۵] اے خدا ہمیں شیطان سے بچا اور جو اولاد ہمیں دے اُسے بھی شیطان سے محفوظ رکھ۔

یہ کوئی ٹونا نہیں، جادو نہیں اور ضروری نہیں کہ عربی کے الفاظ ہی بولے جائیں بلکہ اپنی زبان میں انسان کہہ سکتا ہے کہ الٰہی گناہ ایک بڑی چیز ہے اس سے ہمیں بچا اور بچہ کو بھی بچا۔ اُس وقت کا یہ خیال اس کے اور بچہ کے درمیان دیوار ہو جائے گا۔ اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دُعا کرنے سے جو بچہ پیدا ہو گا اس میں شیطان کا دخل نہیں ہو گا۔

کئی لوگ حیران ہوں گے کہ ہم نے تو کئی دفعہ دُعا پڑھی مگر اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو بتایا گیا ہے۔ مگر ان کے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ لوگ اس دُعا کو صحیح طور پر نہیں پڑھتے صرف ٹونے کے طور پر پڑھتے ہیں۔ دوسرے سب گناہوں کا اِس دُعا سے علاج نہیں ہوتا بلکہ صرف ورثہ کے گناہوں کے لئے ہے۔

ورثہ کے گناہ کے بعد گناہ کی آمیزش انسان کے خیالات میں اُسکے بچپن کے زمانہ میں ہوتی ہے۔ اس کا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ بچہ کی تربیت کا زمانہ رسول کریم ﷺ نے وہ قرار دیا ہے جبکہ بچہ ابھی پیدا ہی ہوا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر ہو سکتا تو رسول کریم ﷺ یہ فرماتے کہ جب بچہ رحم میں ہو اُسی وقت سے اس کی تربیت کا وقت شروع ہو جانا چاہئے۔ مگر یہ چونکہ ہو نہیں سکتا تھا اس لئے پیدائش کے وقت سے تربیت قرار دی اور وہ اس طرح کہ فرمادیا کہ جب بچہ پیدا ہو اسی وقت اس کے کان میں اذان کہی جائے۔ [۲۶] اذان کے الفاظ ٹونے یا جادو کے طور پر بچہ کے کان میں نہیں ڈالے جاتے، بلکہ اس وقت بچہ کے کان میں اذان دینے کا حکم دینے سے ماں باپ کو یہ امر سمجھانا مطلوب ہے کہ بچہ کی تربیت کا وقت ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔

اذان کے علاوہ بھی رسول کریم ﷺ نے بچوں کو بچپن ہی سے ادب سکھانے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے عزیزوں کو بھی بچپن میں ادب سکھا کر عملی ثبوت دیا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ امام حسنؓ جب چھوٹے تھے تو ایک دن کھاتے وقت آپ نے ان کو فرمایا:۔ کُلْ بِیَمِیْنِکَ وَ کُلْ مِمَّا یَلِیْکَ [۲۷] کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔ حضرت امام حسنؓ کی عمر اس وقت

اڑھائی سال کے قریب ہو گی۔ ہمارے ملک میں اگر بچہ سارے کھانے میں ہاتھ ڈالتا اور سارا منہ بھر لیتا ہے بلکہ ارد گرد بیٹھنے والوں کے کپڑے بھی خراب کرتا ہے تو ماں باپ بیٹھے ہنستے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ یا یونہی معمولی سی بات کہہ دیتے ہیں جس سے ان کا مقصد بچہ کو سمجھانا نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانا ہوتا ہے۔ حدیث میں ایک اَور واقعہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ بچپن میں امام حسنؓ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں ڈال لی تو رسول کریم ﷺ نے اُن کے منہ میں انگلی ڈال کر نکال لی۔[۲۸] جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا کام خود کام کر کے کھانا ہے نہ کہ دوسروں کے لئے بوجھ بننا۔

غرض بچپن کی تربیت ہی ہوتی ہے جو انسان کو وہ کچھ بناتی ہے جو آئندہ زندگی میں وہ بنتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ[۲۹] کہ بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ آگے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ماں باپ ہی اُسے مسلمان یا ہندو بناتے ہیں۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو ماں باپ اُسے گرجا میں لے جا کر عیسائی بناتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کے اعمال کی نقل کر کے اور ان کی باتیں سن کر وہی بنتا ہے جو اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بچہ میں نقل کی عادت ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ اسے اچھی باتیں نہ سکھائیں گے تو وہ دوسروں کے افعال کی نقل کریگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں بچوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے خود بڑے ہو کر احمدی ہو جائیں گے۔ مَیں کہتا ہوں اگر بچہ کے کان میں کسی اَور کی آواز نہیں پڑتی تب تو ہو سکتا ہے کہ جب وہ بڑا ہو کر احمدیت کے متعلق سنے تو احمدی ہو جائے لیکن جب اَور آوازیں اس کے کان میں اب بھی پڑ رہی ہیں اور بچہ ساتھ کے ساتھ سیکھ رہا ہے تو وہ وہی بنے گا جو دیکھے گا اور سنے گا۔ اگر فرشتے اُسے اپنی بات نہیں سنائیں گے تو شیطان اس کا ساتھی بن جائے گا۔ اگر نیک باتیں اس کے کان میں نہ پڑیں گی تو بد پڑیں گی اور وہ بد ہو جائے گا۔

پس اگر آپ لوگ گناہ کا سلسلہ روکنا چاہتے ہیں تو جس طرح سگریشن کیمپ ہوتا ہے اُس طرح بناؤ اور آئندہ اولاد سے گناہ کی بیماری دُور کر دو تا کہ آئندہ نسلیں محفوظ رہیں۔

تربیت کے طریق

اب مَیں تربیت کے طریق بتاتا ہوں:۔

(۱) بچہ کے پیدا ہونے پر سب سے پہلی تربیت اذان ہے۔ جس کے متعلق پہلے بتا چکا ہوں۔

(۲) یہ کہ بچہ کو صاف رکھا جائے۔ پیشاب پاخانہ فوراً صاف کر دیا جائے۔ شاید بعض لوگ یہ کہیں یہ کام تو عورتوں کا ہے یہ صحیح ہے۔ مگر پہلے مردوں میں یہ خیال پیدا ہو گا تو پھر عورتوں میں ہو گا۔ پس مردوں کا کام ہے کہ عورتوں کو یہ باتیں سمجھائیں کہ جو بچہ صاف نہ رہے اس میں صاف خیالات کہاں سے آئیں گے۔ مگر دیکھا گیا ہے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ مجلس میں اگر بچہ کو پاخانہ آئے تو کپڑے پر پھرا کر عورتیں کپڑا بغل میں دبا لیتی ہیں اور قادیان کے ارد گرد کی دیہاتی عورتوں کو تو دیکھا ہے، جوتی میں پاخانہ پھرا کر اِدھر اُدھر پھینک دیتی ہیں۔ جب بچہ کی ظاہری صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا تو باطنی صفائی کس طرح ہو گی؟ لیکن اگر بچہ ظاہر میں صاف ہو تو اس کا اثر اس کے باطن پر پڑے گا اور اس کا باطن بھی پاک ہو گا۔ کیونکہ غلاظت کی وجہ سے جو گناہ پیدا ہوتے ہیں اُن سے بچا رہے گا۔ یہ بات طب کی رو سے ثابت ہو گئی ہے کہ بچہ میں پہلے گناہ غلاظت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب بچہ کا اندام نہانی صاف نہ ہو تو بچہ اسے کھجلاتا ہے۔ اِس سے وہ مزا محسوس کرتا اور اس طرح اُسے شہوانی قوت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اگر بچہ کو صاف رکھا جائے اور جوں جوں وہ بڑا ہو اسے بتایا جائے کہ ان مقامات کو صفائی کے لئے دھونا ضروری ہوتا ہے تو وہ شہوانی برائیوں سے بہت حد تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ تربیت بھی پہلے دن سے شروع ہونی چاہئے۔

(۳) غذا بچہ کو وقت مقررہ پر دینی چاہئے۔ اس سے بچہ میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہشات کو دبا سکتا ہے اور اس طرح بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ چوری، لُوٹ کھسوٹ وغیرہ بہت سی برائیاں خواہشات کو نہ دبانے کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ایسے انسان میں جذبات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب بچہ رویا ماں نے اسی وقت دودھ دے دیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ مقررہ وقت پر دُودھ دینا چاہئے اور بڑی عمر کے بچوں میں یہ عادت ڈالنی چاہئے کہ وقت پر کھانا دیا جائے۔ اس سے یہ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ (۱) پابندی وقت کا احساس۔ (۲) خواہش کو دبانا (۳) صحت (۴) مل کر کام کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے بچوں میں خود غرضی اور نفسانیت نہ ہو گی جبکہ وہ سب کے سب ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے (۵) اسراف کی عادت نہ ہو گی۔ جو بچہ ہر وقت کھانے کی چیزیں لیتا رہتا ہے وہ ان میں سے کچھ ضائع کرے گا کچھ کھائے گا لیکن اگر مقررہ وقت پر مقررہ مقدار میں اسے کھانے کی چیز دی جائے گی تو وہ اس میں سے کچھ ضائع نہیں کرے گا۔ پس اس طرح بچہ میں تھوڑی چیز استعمال کرنے اور اسی سے خواہش کے پورا کرنے کی عادت ہو گی (۶) لالچ کا مقابلہ کرنے کی عادت ہو گی۔ مثلاً بازار میں

چلتے ہوئے بچہ ایک چیز دیکھ کر کہتا ہے یہ لینی ہے۔ اگر اُس وقت اُسے نہ لے کر دی جائے تو وہ اپنی خواہش کو دبالے گا اور پھر بڑا ہونے پر کئی دفعہ دل میں پیدا شدہ لالچ کا مقابلہ کرنے کی اس کو عادت ہو جائے گی۔

اسی طرح گھر میں چیز پڑی ہو اور بچہ مانگے تو کہہ دینا چاہئے کہ کھانے کے وقت پر ملے گی۔ اس سے بھی اس میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ نفس کو دبا سکے گا۔

زمیندار گنّے، مولی، گاجر، گڑ وغیرہ کے متعلق اسی طرح کر سکتے ہیں۔

(۴) بچہ کو مقررہ وقت پر پاخانہ کی عادت ڈالنی چاہئے۔ یہ اس کی صحت کے لئے بھی مفید ہے۔ لیکن اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اعضاء میں وقت کی پابندی کی حِس پیدا ہو جاتی ہے۔ وقت مقررہ پر پاخانہ پھرنے سے انتڑیوں کو عادت ہو جاتی ہے اور پھر مقررہ وقت پر ہی پاخانہ آتا ہے۔ یورپ میں تو بعض لوگ حاجت سے وقت بتا دیتے ہیں کہ اب یہ وقت ہو گا کیونکہ مقررہ وقت پر انہیں پاخانہ کی حاجت محسوس ہوتی ہے۔ تو بچہ کے لئے یہ بہت ضروری بات ہے۔ وقت پر کام کرنے والے بچہ میں نماز، روزہ کی پختہ عادت پیدا ہو جاتی ہے اور قومی کاموں کو پیچھے ڈالنے کی عادت نہیں پیدا ہوتی۔ علاوہ ازیں بے جا جوش دب جاتے ہیں کیونکہ بے جا جوش کا ایک بڑا سبب بے وقت کام کرنے کی عادت ہے۔ خصوصاً بے وقت کھانا کھانا۔ مثلاً بچہ کھیل کود میں مشغول ہوا۔ وقت پر ماں نے کھانا کھانے کے لئے بلایا مگر نہ آیا۔ پھر جب آیا تو ماں نے کہا ٹھہرو کھانا گرم کر دوں۔ چونکہ اسے اُس وقت بھوک لگی ہوئی ہوتی ہے اس لئے وہ روتا چلاتا اور بے جا جوش ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اُسی وقت کھانے کے لئے آتا ہے جب اس سے بھوک دبائی نہیں جاتی اور اس وجہ سے نہایت شور کرتا ہے۔

(۵) اسی طرح غذا اندازہ کے مطابق دی جائے۔ اس سے قناعت پیدا ہوتی اور حرص دُور ہوتی ہے۔

(۶) قسم قسم کی خوراک دی جائے۔ گوشت، ترکاریاں اور پھل دیئے جائیں کیونکہ غذاؤں سے بھی مختلف اقسام کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ پس مختلف اخلاق کے لئے مختلف غذاؤں کا دیا جانا ضروری ہے۔ ہاں بچپن میں گوشت کم اور ترکاریاں زیادہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ گوشت ہیجان پیدا کرتا ہے اور بچپن کے زمانہ میں ہیجان کم ہونا چاہئے۔

(۷) جب بچہ ذرا بڑا ہو تو کھیل کود کے طور پر اس سے کام لینا چاہئے۔ مثلاً یہ کہ فلاں برتن

اُٹھالاؤ۔ یہ چیز وہاں رکھ آؤ۔ یہ چیز فلاں کو دے آؤ۔ اِسی قسم کے اَور کام کرانے چاہئیں ہاں ایک وقت تک اسے اپنے طور پر کھیلنے کی بھی اجازت دینی چاہئے۔

(۸) بچہ کو عادت ڈالنی چاہئے کہ وہ اپنے نفس پر اعتبار پیدا کرے۔ مثلاً چیز سامنے ہو اور اُسے کہا جائے ابھی نہیں ملے گی، فلاں وقت ملے گی، یہ نہیں کہ چھپا دی جائے، کیونکہ اِس نمونہ کو دیکھ کر وہ بھی اسی طرح کرے گا اور اس میں چوری کی عادت پیدا ہو جائے گی۔

(۹) بچہ سے زیادہ پیار بھی نہیں کرنا چاہئے۔ زیادہ چومنے چاٹنے کی عادت سے بہت سی برائیاں بچہ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جس مجلس میں وہ جاتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ پیار کریں اس سے اس میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱۰) ماں باپ کو چاہئے کہ ایثار سے کام لیں۔ مثلاً اگر بچہ بیمار ہے اور کوئی چیز اُس نے نہیں کھانی تو وہ بھی نہ کھائیں اور نہ گھر میں لائیں بلکہ اُسے کہیں کہ تم نے نہیں کھانی اس لئے ہم بھی نہیں کھاتے۔ اس سے بچّہ میں بھی ایثار کی صفت پیدا ہوگی۔

(۱۱) بیماری میں بچہ کے متعلق بہت احتیاط کرنی چاہئے کیونکہ بُزدلی، خود غرضی، چڑچڑاہٹ جذبات پر قابو نہ ہونا اس قسم کی برائیاں اکثر لمبی بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ کئی لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو بُلا بُلا کر پاس بٹھاتے ہیں۔ لیکن کئی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اُن کے پاس سے گزرے تو کہہ اٹھتے ہیں ارے دیکھتا نہیں، اندھا ہو گیا ہے۔ یہ خرابی لمبی بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ بیماری میں بیمار کو آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے وہ آرام پانا اپنا حق سمجھ لیتا ہے اور ہر وقت آرام چاہتا ہے۔

(۱۲) بچوں کو ڈراؤنی کہانیاں نہیں سنانی چاہئیں اِس سے اُن میں بُزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے انسان بڑے ہو کر بہادری کے کام نہیں کر سکتے۔ اگر بچہ میں بُزدلی پیدا ہو جائے تو اُسے بہادری کی کہانیاں سنانی چاہئیں اور بہادر لڑکوں کے ساتھ کھلانا چاہئے۔

(۱۳) بچہ کو اپنے دوست خود نہ چننے دیئے جائیں بلکہ ماں باپ چنیں اور دیکھیں کہ کن بچوں کے اخلاق اعلیٰ ہیں۔ اس میں ماں باپ کو بھی یہ فائدہ ہو گا کہ وہ دیکھیں گے کن کے بچوں کے اخلاق اعلیٰ ہیں۔ دوسرے ایک دوسرے سے تعاون شروع ہو جائے گا کیونکہ جب خود ماں باپ بچہ سے کہیں گے کہ فلاں بچوں سے کھیلا کرو تو اس طرح ان بچوں کے اخلاق کی نگرانی بھی کریں گے۔

(۱۴) بچہ کو اس کی عمر کے مطابق بعض ذمہ داری کے کام دیئے جائیں تاکہ اس میں ذمہ

داری کا احساس ہو۔ ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے تھے۔ اس نے دونوں کو بُلا کر اُن میں سے ایک کو سیب دیا اور کہا بانٹ کر کھالو۔ جب وہ سیب لے کر چلنے لگا تو باپ نے کہا جانتے ہو کس طرح بانٹنا ہے۔ اُس نے کہا نہیں۔ باپ نے کہا جو بانٹے وہ تھوڑا لے اور دوسرے کو زیادہ دے یہ سن کر لڑکے نے کہا پھر دوسرے کو دیں کہ وہ بانٹے۔ معلوم ہوتا ہے اس لڑکے میں پہلے ہی بُری عادت پڑ چکی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امر کو سمجھتا تھا کہ اگر ذمہ داری مجھ پر پڑی تو مجھے دوسرے کو اپنے پر مقدّم کرنا پڑے گا۔ اس عادت کے لئے بعض کھیلیں نہایت مفید ہیں۔ جیسے کہ فٹ بال وغیرہ۔

مگر کھیل میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کوئی بُری عادت نہ پڑے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تائید کرتے ہیں اور دوسرے کے بچہ کو اپنے بچہ کی بات ماننے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس طرح بچہ کو اپنی بات منوانے کی ضد پڑ جاتی ہے۔

(۱۵) بچہ کے دل میں یہ بات ڈالنی چاہئے کہ وہ نیک ہے اور اچھا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے کیا نکتہ فرمایا ہے کہ بچہ کو گالیاں نہ دو کیونکہ گالیاں دینے پر فرشتے کہتے ہیں ایسا ہی ہو جائے اور وہ ہو جاتا ہے۔[۳۰]

اس کا یہ مطلب ہے کہ فرشتے اعمال کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جب بچہ کو کہا جاتا ہے کہ تُو بد ہے تو وہ اپنے ذہن میں یہ نقشہ جمالیتا ہے کہ مَیں بد ہوں اور پھر وہ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ پس بچہ کو گالیاں نہیں دینی چاہئیں بلکہ اچھے اخلاق سکھانے چاہئیں اور بچہ کی تعریف کرنی چاہئے۔

آج صبح میری لڑکی پیسہ مانگنے آئی۔ جب مَیں نے پیسہ دیا تو بایاں ہاتھ کیا۔ مَیں نے کہا یہ تو ٹھیک نہیں، کہنے لگی ہاں غلطی ہے پھر نہیں کروں گی۔ اسے غلطی کا احساس کرانے سے فوراً احساس ہو گیا۔

(۱۶) بچہ میں ضِد کی عادت نہیں پیدا ہونے دینی چاہئے۔ اگر بچہ کسی بات پر ضِد کرے تو اس کا علاج یہ ہے کہ کسی اور کام میں اُسے لگا دیا جائے اور ضِد کی وجہ معلوم کر کے اُسے دور کیا جائے۔

(۱۷) بچہ سے ادب سے کلام کرنا چاہئے۔ بچہ نقّال ہوتا ہے، اگر تم اُسے تُو کہہ کر مخاطب کرو گے تو وہ بھی تُو کہے گا۔

(۱۸) بچہ کے سامنے جھوٹ، تکبر اور تُرش روئی وغیرہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ وہ بھی یہ باتیں سیکھ لے گا۔ عام طور پر ماں باپ بچہ کو جھوٹ بولنا سکھاتے ہیں۔ ماں نے بچہ کے سامنے کوئی کام کیا

ہوتا ہے مگر جب باپ پوچھتا ہے تو کہہ دیتی ہے مَیں نے نہیں کیا۔ اس سے بچہ میں بھی جھوٹ بولنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بچہ کی غیر موجودگی میں ماں باپ یہ کام کریں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو ہر وقت اِن عیبوں سے نہیں بچ سکتے وہ کم سے کم بچوں کے سامنے ایسے فعل نہ کریں تا مرض آگے نسل کو بھی مبتلاء نہ کرے۔

(۱۹) بچہ کو ہر قسم کے نشہ سے بچایا جائے۔ نشوں سے بچہ کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے جھوٹ کی بھی عادت پیدا ہوتی ہے اور نشہ پینے والا اندھا دُھند تقلید کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایک شخص حضرت خلیفہ اول کا رشتہ دار تھا وہ ایک دفعہ ایک لڑکے کو لے آیا اور کہتا تھا اِسے بھی مَیں اپنے جیسا ہی بنالوں گا۔ وہ نشہ وغیرہ پیتا اور مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ حضرت خلیفہ اول نے اُسے کہا تم تو خراب ہو چکے ہو اِسے کیوں خراب کرتے ہو، مگر وہ باز نہ آیا۔ ایک موقع پر آپ نے اُس لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور اُسے سمجھایا کہ تمہاری عقل کیوں ماری گئی ہے۔ اِس کے ساتھ پھرتے ہو، کوئی کام سیکھو۔ آپ کے سمجھانے سے وہ لڑکا اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر کچھ مدت کے بعد وہ ایک اور لڑکا لے آیا۔ اور آکر حضرت خلیفہ اول سے کہنے لگا۔ اَب اِسے خراب کرو تو جانوں۔ اُس کے نزدیک یہی خراب کرنا تھا کہ اُس کے قبضہ سے نکال دیا جائے۔ حضرت خلیفہ اول نے بہتیرا اس لڑکے کو سمجھایا اور کہا کہ مجھ سے روپیہ لے لو اور کوئی کام کرو، مگر اُس نے نہ مانا۔ آخر آپ نے اُس شخص سے پوچھا اِسے تم نے کیا کیا ہے۔ تو وہ کہنے لگا اس کو مَیں نشہ پلاتا ہوں اور اس وجہ سے اس میں ہمت ہی نہیں رہی کہ میری تقلید کو چھوڑ سکے۔ غرض نشہ سے اقدام کی قوت ماری جاتی ہے۔

جھوٹ سب سے خطرناک مرض ہے کیونکہ اس کے پیدا ہونے کے ذرائع نہایت باریک ہیں اِس مرض سے بچہ کو خاص طور پر بچانا چاہئے۔ بعض ایسے اسباب ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ مرض آپ ہی آپ بچہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ بچہ کا دماغ نہایت بلند پرواز واقع ہؤا ہے وہ جو بات سنتا ہے آپ ہی اُس کی ایک حقیقت بنا لیتا ہے۔ ہماری ہمشیرہ بچپن میں روز ایک لمبی خواب سنایا کرتی تھیں۔ ہم حیران ہوتے کہ روز اِسے کس طرح خواب آجاتی ہے۔ آخر معلوم ہؤا کہ سونے کے وقت جو خیال کرتی تھیں وہ اُسے خواب سمجھ لیتی تھیں۔ تو بچہ جو کچھ سوچتا ہے اُسے واقعہ خیال کرنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ اُسے جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اِس لئے بچہ کو سمجھاتے رہنا چاہئے کہ خیال اَور چیز ہے اور واقعہ اَور چیز ہے۔ اگر خیال کی حقیقت بچہ کے اچھی طرح ذہن

نشین کر دی جائے تو بچہ جھوٹ سے بچ سکتا ہے۔

(۲۰) بچوں کو علیحدہ بیٹھ کر کھیلنے سے روکنا چاہئے۔

(۲۱) ننگا ہونے سے روکنا چاہئے۔

(۲۲) بچوں کو عادت ڈالنی چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنی غلطی کا اقرار کریں اور اس کے طریق یہ ہیں۔ (۱) اُن کے سامنے اپنے قصوروں پر پردہ نہ ڈالا جائے۔ (۲) اگر بچہ سے غلطی ہو جائے تو اس سے اِس طرح ہمدردی کریں کہ بچہ کو یہ محسوس ہو کہ میرا کوئی سخت نقصان ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں اور اُسے سمجھانا چاہئے کہ دیکھو اِس غلطی سے یہ نقصان ہو گیا ہے۔ (۳) آئندہ غلطی سے بچانے کے لئے بچہ سے اس طرح گفتگو کی جائے کہ بچہ کو محسوس ہو کہ میری غلطی کی وجہ سے ماں باپ کو تکلیف اُٹھانی پڑی ہے۔ مثلاً بچہ سے جو نقصان ہوا ہو وہ اس کے سامنے اس کی قیمت وغیرہ ادا کرے اِس سے بچہ میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ نقصان کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ کفارہ نہایت گندہ عقیدہ ہے مگر میرے نزدیک بچہ کی اِس طرح تربیت کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ (۴) بچہ کو سرزنش الگ لے جا کر کرنی چاہئے۔

(۲۳) بچہ کو کچھ مال کا مالک بنانا چاہئے۔ اس سے بچہ میں یہ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ (۱) صدقہ دینے کی عادت (۲) کفایت شعاری (۳) رشتہ داروں کی امداد کرنا مثلاً بچہ کے پاس تین پیسے ہوں تو اُسے کہا جائے ایک پیسہ کی کوئی چیز لاؤ اور دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھاؤ۔ ایک پیسہ کا کوئی کھلونا خرید لو اور ایک پیسہ صدقہ میں دے دو۔

(۲۴) اِسی طرح بچوں کا مشترکہ مال ہو۔ مثلاً کوئی کھلونا دیا جائے تو کہا جائے۔ یہ تم سب بچوں کا ہے، سب اس کے ساتھ کھیلو اور کوئی خراب نہ کرے۔ اِس طرح قومی مال کی حفاظت پیدا ہوتی ہے۔

(۲۵) بچہ کو آداب و قواعد تہذیب سکھاتے رہنا چاہئے۔

(۲۶) بچہ کی ورزش کا بھی اور اُسے جفاکش بنانے کا بھی خیال رکھنا چاہئے کیونکہ یہ بات دنیوی ترقی اور اصلاح نفس دونوں میں یکساں طور پر مفید ہے۔

اخلاق اور روحانیت کی جو تعریف میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس کے مطابق وہی بچہ تربیت یافتہ کہلائے گا جس میں مندرجہ ذیل باتیں ہوں۔ (۱) ذاتی طور پر بااخلاق ہو اور اس میں روحانیت ہو (۲) دوسروں کو ایسا بنانے کی قابلیت رکھتا ہو (۳) قانونِ سلسلہ کے مطابق چلنے کی قابلیت رکھتا ہو

(۴) اللہ تعالیٰ سے خالص محبت رکھتا ہو جو سب محبتوں پر غالب ہو۔

پہلے امر کا معیار یہ ہے کہ (۱) جب بچہ بڑا ہو تو امور شرعیہ کی لفظاً و عملاً و عقیدتاً پابندی کرے۔ (۲) اس کی قوت ارادی مضبوط ہو تا آئندہ فتنہ میں نہ پڑے۔ (۳) اس کا اپنی ضروریات زندگی کا خیال رکھنا اور جان بچانے کی قابلیت رکھنا۔ (۴) اپنے اموال و جائیداد بچانے کی قابلیت کا ہونا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

دوسرے امر کا معیار یہ ہے :۔ (۱) اخلاق کا اچھا نمونہ پیش کرے۔ (۲) دوسروں کی تربیت اور تبلیغ میں حصہ لے۔ (۳) اپنے ذرائع کو ضائع ہونے نہ دے بلکہ انہیں اچھی طرح استعمال کرے جس سے جماعت و دین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

تیسرے امر یعنی قانونِ سلسلہ کے مطابق چلنے کی طاقت رکھنے کا یہ معیار ہے:۔ (۱) اپنی صحت کا خیال رکھنے والا ہو۔ (۲) جماعتی اموال اور حقوق کا محافظ ہو۔ (۳) کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسروں کے حقوق کو نقصان پہنچے۔ (۴) قومی جزاء اور سزا کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔

چوتھے امر کا معیار یہ ہے:۔ (۱) کلام الٰہی کا شوق اور ادب ہو۔ (۲) خدا تعالیٰ کا نام اُسے ہر حالت میں مؤدب اور ساکن بنا دے۔ (۳) دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بکلی الگ ہو۔ (۴) خدا کی محبت کی علامات اس کے وجود میں پائی جائیں۔

اب بچہ کی تربیت کرنے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جن میں گناہ پیدا ہو گیا اُن سے کس طرح دُور کرایا جائے؟ یہ کل بیان کروں گا۔

خطاب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی

(فرمودہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۵ء بر موقع جلسہ سالانہ)

تشہد تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

چونکہ مجھے کھانسی کی تکلیف تھی اس وجہ سے کل کی تقریر اور آج کی تقریر کرنے سے جو عورتوں میں کی گئی میرا گلا بیٹھ گیا ہے لیکن احباب گھبرائیں نہیں اللہ تعالیٰ چاہے تو اُن تک آواز پہنچ جائے گی۔

مَیں اصل تقریر شروع کرنے سے پہلے دوستوں کو یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ذکر الٰہی کی عظمت کو اچھی طرح سمجھیں۔ یہاں وہ کسی تماشہ اور کھیل کے لئے جمع نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے اور اس کا نام لینے کے لئے آتے ہیں اس لئے ذکر الٰہی کے آداب کو مدنظر رکھنا چاہئے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض دوست اس ادب کو مدنظر نہیں رکھتے اور بلاوجہ اور بلاسبب جلسہ گاہ سے اُٹھ کر باہر چلے جاتے اور اِدھر اُدھر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ جلسہ پر ایک کافی تعداد جو آٹھ سو اور ہزار کے قریب ہوتی ہے غیر احمدیوں کی ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے نفس پر جبر کر کے وعظ سننے کے عادی نہیں ہوتے اور ان کا کثیر حصہ جلسہ گاہ میں آتا اور جاتا رہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ وہی لوگ آنے جانے والے نہیں ہوتے بلکہ بعض احمدی بھی اس جلسہ گاہ سے باہر چلے جاتے ہیں کہ چلو ان کو باہر جا کر تبلیغ کریں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے مذہب میں انسان پر سب سے بڑا فرض اپنی جان کا ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت اپنی ہدایت کی فکر میں ہو اگر کوئی دوسرا گمراہی میں پڑتا ہے تو پڑنے دو اپنی ہدایت کی فکر دوسرے کی خاطر چھوڑ نہ دو۔[1] دین کے لئے مال قربان کیا جاتا ہے اور جان قربان کی جاتی ہے مگر دین وہ چیز ہے کہ ساری دنیا کی خاطر قربان کرنے کے لئے کوئی مؤمن تیار نہیں ہو سکتا۔ پس اگر کسی مجبوری کی وجہ سے جلسہ گاہ سے اُٹھنا پڑے اور بعض دفعہ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جیسے قضائے حاجت کے لئے جانا تو بے شک جاؤ مگر فارغ ہو کر جلدی واپس آجانا چاہئے

کیونکہ کیا معلوم ہے کہ کب وہ گھڑی آجائے جس کے لئے انسان ساری عمر کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایک گھڑی ایسی آسکتی ہے کہ اُس وقت ایک کلمہ انسان کو کافر سے مؤمن بنا دیتا ہے۔ اسے شیطانی سے رحمانی بنا دیتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہی دیکھ لو۔ آپ رسول کریم ﷺ کی مخالفت میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے مگر ایک بات ان کے کان میں ایسی پڑ گئی جس نے اُن کی حالت بالکل بدل دی۔ وہ رسول کریم ﷺ کے قتل کے لئے نکلے کہ انہیں معلوم ہوا اُن کی اپنی بہن مسلمان ہو چکی ہے۔ اس پر وہ اپنی بہن کے ہاں گئے اور گھر میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے سنا۔ غصہ میں آکر اندر گھس گئے اور اپنے بہنوئی کو مارنے لگے۔ اِس پر بہن بچانے لگی تو اس کے بھی چوٹ آئی۔ اِس حالت کو دیکھ کر اُن کے دل میں کچھ ندامت پیدا ہوئی تھی کہ بہن نے کہا عمر! تم ہم پر اس لئے ناراض ہوتے ہو کہ ہم نے ایک خدا کو مانا ہے یہ سن کر وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور اپنی بہن سے کہا جو تم پڑھ رہے تھے وہ مجھے بھی سناؤ۔ اُن کی بہن نے کہا۔ پاک ہو کر آؤ تو سنائیں۔ وہ نہا کر آئے اور اُن کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی گئی۔ جسے سن کر اُن کے آنسو رواں ہو گئے اور سیدھے رسول کریم ﷺ کے پاس آئے، آکر دستک دی، جب معلوم ہوا کہ عمر ہیں تو بعض نے کہا یہ دروازہ نہیں کھولنا چاہئے وہ سخت آدمی ہیں، نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت حمزہ نے کہا کہ اگر مخالفت کی نیت سے آئے ہیں تو ہمارے پاس بھی تلوار ہے۔ آخر رسول کریم ﷺ نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جب سامنے آئے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا عمر! کب تک مخالفت کرتے رہو گے۔ اسپر انہوں نے کہا مَیں تو غلامی کے لئے آیا ہوں۔[۳۲] اَب دیکھو انہیں کس طرح ہدایت نصیب ہوئی؟ اگر وہ اس مجلس میں نہ جاتے تو شاید عمر ایمان سے محروم رہتے۔ آپ لوگوں کے لئے سارا سال آرام کرنے کے لئے پڑا ہے اس لئے یہ چند دن کی تکلیف اُٹھا کر بھی خدا تعالیٰ کا کلام سننا چاہئے اور کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

دوسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ مَیں نے کل بتایا تھا مَیں نے قرآن کریم کے ترجمہ کا کام شروع کیا ہوا ہے اور خدا کے فضل سے ۲۰ دسمبر کو سورۂ بقرہ کا ترجمہ ختم ہو گیا ہے۔ اور اُمید ہے کہ اگلے سال ساڑھے سات پاروں کی پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ مَیں چاہتا ہوں کہ احباب دُعا کریں۔ بغیر اس کے کہ اس کام میں کوئی روک پیدا ہو میں اس کام کو سرانجام دے کر اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اور تفسیر اور ترجمہ دوستوں تک پہنچا سکوں۔

تیسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کل مَیں نے مالی مشکلات کی طرف جماعت کو توجہ دلائی

تھی آج مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ یہ بھی سلسلہ کی سچائی کی ایک علامت ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے۔ مَیں نے بیسیوں کتابیں پڑھی ہیں جن میں لکھا ہے کہ محمد (ﷺ) جھوٹا ہے مگر میں اُن کتابوں کو کیا کروں جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ محمد (ﷺ) ان لوگوں میں جو غریب، وحشی اور غیر تعلیم یافتہ ہیں ایک کچے مکان میں بیٹھا ہوا جو چھوٹا سا کمرہ ہے اور مسجد کے نام سے مشہور ہے اور جس کی چھت پر کھجور کی ٹہنیاں بغیر صاف کئے پڑی ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو اِتنا پانی ٹپکتا ہے کہ سجدہ پانی میں کرنا پڑتا ہے، ایسے لوگوں میں جن میں سے کسی کے پاس بھی سارا تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں، یہ مشورہ کر رہا ہے کہ ساری دُنیا کو کس طرح فتح کرنا چاہئے اور پھر ایسا کر کے بھی دکھا دیتا ہے۔ وہ مصنف کہتا ہے لاکھوں صفحوں کے مقابلہ میں جب مَیں اس واقعہ کو دیکھتا ہوں تو سب باتیں حقیر معلوم ہوتی ہیں۔

اِسی طرح جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعویٰ کیا تھا اُسی وقت اُمراء اور بادشاہ آپ کے ساتھ شامل ہو جاتے تو کیونکر ثابت ہوتا کہ آپ کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ خدا کا فعل تھا، وہ تو امراء اور بادشاہوں کا فعل سمجھا جاتا۔ مگر جب آپ نے دعویٰ کیا تو سب بھائی بند اور عزیز رشتہ دار آپ کے دشمن ہو گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سب سے بڑا دوست اور آپ کے علم اور معرفت کا سب سے بڑا معترف مولوی محمد حسین بٹالوی تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ آپ کا دماغ بگڑ گیا ہے۔ مَیں نے اسے بڑھایا تھا، مَیں ہی اِسے گراؤں گا۔ ساری دنیا کے علماء نے آپ کا مقابلہ کیا۔ عرب اور عجم سے آپ کے خلاف فتوے منگائے گئے مگر باوجود دُنیا کی اسقدر مخالفت کے آپ اکیلے اُٹھے اور کہا یہ ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں اور ساری دُنیا میری دشمن بن گئی ہے۔ مگر مَیں اس آواز کو کیا کروں جو مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے سنائی دے رہی ہے کہ

"دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اُسے قبول نہیں کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا"۔ [۳۳]

مَیں اس آواز کا کس طرح انکار کر دوں۔ اُس وقت گورنمنٹ بھی آپ کی مخالف تھی اور تمام لوگ بھی دشمن تھے مگر نتیجہ کیا نکلا؟ وہ ایک طرف تھا اور ساری دُنیا دوسری طرف۔ مگر یہ اتنے لوگ اس کے شکار پکڑے ہوئے یہاں بیٹھے ہیں اور یہ تو اس جگہ کا نظارہ ہے باہر لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

مَیں پچھلے سال جب شام گیا تو دمشق کے ایک بڑے ادیب نے جو ادب کے مجدد مانے جاتے ہیں مجھے تمسخر سے کہا۔ آپ مرزا صاحب کی کتابوں کی یہاں اشاعت نہ کریں کیونکہ ان میں غلطیاں ہیں اور لوگ ان غلطیوں کو دیکھ کر اُن سے بدظن ہو جائیں گے۔ مَیں نے کہا۔ لو مَیں یہاں بیٹھا ہوں اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک تمہارے اس دعویٰ کو باطل نہ کرلوں۔ تم حضرت مسیح موعود کی کتابوں پر جو اعتراض کرنا چاہتے ہو کرلو۔ یہ سن کر وہ کہنے لگا۔ مَیں تو آپ کا خیر خواہ ہوں مَیں آپ کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتا۔ مَیں نے کہا ضرور کرو اگر کر سکتے ہو۔ کہنے لگا۔ اس میں آپ کا نقصان ہو گا۔ مَیں نے کہا اگر ہم جھوٹے ہیں تو تمہارا فرض ہے کہ مقابلہ کرو اور اگر ہم سچے ہیں تو تمہارے مقابلہ سے ہمیں نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ فائدہ ہو گا۔ مگر اُس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ پھر کہنے لگا عرب ایک ہندوستانی کو مسیح موعود نہیں مان سکتے۔ مَیں نے کہا مَیں یہاں مشن قائم کرنے والا ہوں۔ ہم یہاں جماعت قائم کریں گے تم زور لگالو۔ خدا کی قدرت ہم وہاں پانچ دن کے لئے ہی گئے تھے۔ جب چلنے لگے تو ایک عالم کا جو عربی، فارسی، ترکی کا ماہر تھا رات کے دس بجے کے قریب رقعہ آیا کہ مَیں ملاقات کی خاطر صبح سے بیٹھا ہوں ممکن ہے اب بھی مجھے ملاقات کے لئے وقت نہ ملے اس لئے مَیں اس رقعہ کے ذریعہ اطلاع دیتا ہوں کہ مَیں مرزا صاحب پر ایمان لے آیا۔ اب آپ جہاں چاہیں مجھے تبلیغ کے لئے بھیج دیں۔ اور اب تو وہاں ہمارا وفد پہنچ گیا ہے اور اس کے ذریعہ جماعت قائم ہو گئی ہے اور اُسی شخص نے جس نے کہا تھا کہ یہاں کوئی شخص نہیں مان سکتا کہلا بھیجا ہے کہ مجھ پر بدظنی نہ کی جائے مَیں کبھی آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

پس آپ لوگ اپنی غربت اور کمزوری کا خیال نہ کریں۔ وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنی غربت اور کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہوں گے وہ مشرک ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سلسلہ کا کام اُس نے کرنا ہے۔ پھر جو شخص اپنے آپ کو ناکارہ سمجھتا ہے وہ خدا تعالیٰ پر الزام لگاتا ہے کہ اس علیم ہستی نے دنیا کو فتح کرنے کے لئے یہ ناکارہ ہتھیار چُنا۔ اسے کون اچھا سپاہی کہے گا جو ٹوٹی ہوئی بندوق یا تلوار اُٹھا کر دشمن کے مقابلہ میں نکلتا ہے۔ پھر جس کو خدا تعالیٰ نے سلسلہ کی خدمت کے لئے چُنا وہ ناکارہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ کام کا انسان ہے اور جسے خدا تعالیٰ چُنتا ہے وہ ذلیل نہیں ہوتا بلکہ وہی معزز ہے۔

مدینہ کے ایک رئیس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کہا تھا کہ مدینہ کا سب سے معزز وہاں کے سب سے ذلیل شخص (رسول کریم ﷺ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ) کو مدینہ سے نکال دے

گا۔[۳۴] اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وہ کہتا ہے عزت اس کے پاس ہے۔ عزت تو رسول کو ماننے میں ہوتی ہے اس کے الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کا بیٹا رسول کریم ﷺ کے پاس آیا اور آکر کہنے لگا مَیں نے سنا ہے میرے باپ نے اس اس طرح کہا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اُسے قتل کیا جائے، مگر یہ نہ ہو کہ کوئی اور قتل کرے۔ کسی وقت شیطان مجھے دھوکا دے کر اس کے خلاف بھڑکائے اس لئے اُس کے قتل کی خدمت میرے سپرد کی جائے۔[۳۵] یہ بات سن کر اُسے اپنی عزت کا اچھی طرح احساس ہو گیا ہو گا۔

آپ لوگ اپنے ذرائع، علم، حیثیت کی کمی پر نگاہ نہ رکھیں۔ یہ موجودہ جماعت جن ذرائع سے بنی ہے وہ اس وقت کے ذرائع سے بہت کم تھے اور جب لوگ کئی لاکھ کو کھینچ کر سلسلہ میں لے آئے ہیں تو یہ کئی لاکھ کئی کروڑ کو کیوں نہ لائیں گے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے مَیں نے ایک رؤیا دیکھی کہ مَیں خطبہ پڑھ رہا ہوں جس میں کہتا ہوں کہ ہمیں اپنے بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے کیونکہ اس وقت جو بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے اس سے ہزار گنے زیادہ بوجھ ان کے کندھوں پر ہو گا۔ پس ہماری آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں دیکھیں گی کہ دنیا کی زبردست طاقتیں اور قوتیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گی کہ اب احمدیت کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ مگر خدا تعالیٰ اسی پر راضی نہ ہو گا وہ جماعت کو اور بڑھاتا جائے گا جب تک کہ لوگ یہ نہ کہہ اُٹھیں کہ دُنیا میں احمدیت ہی ایک مذہب ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس زمانہ میں جبکہ آپ کے ساتھ ایک بھی آدمی نہ تھا فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ تمہاری جماعت اِسقدر ترقی کرے گی کہ باقی اقوام دنیا کی اس طرح رہ جائیں گی جس طرح آج کل پرانی خانہ بدوش قومیں ہیں۔[۳۶] پس کچھ لوگ آج مانیں گے، کچھ کل، کچھ پرسوں، اسی طرح روز بروز اور دن بدن جماعت بڑھتی جائے گی اور ساعت بہ ساعت اس کی قوت ترقی کرتی جائے گی۔ غریب، امیر، عام انسان و خواص و بادشاہ اور رعایا حضرت مسیح موعود پر ایمان لائے گی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی سلسلہ رہ جائے گا اور باقی مذاہب اس کے مقابلہ میں اسی طرح ماند ہو جائیں گے جس طرح سورج کے سامنے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔

یہ خدا تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتیں ہیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔ پس دنیا کی بری سے بڑی روکیں ہمارے ایمانوں کو متزلزل نہیں کر سکتیں اور ہم لوگوں کی مخالفت سے مایوس نہیں ہو سکتے۔ جس شخص نے یہ دیکھا ہو کہ ایک اکیلے انسان کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کی جماعت بن گئی ہے وہ آئندہ

ترقی سے کیونکر ناامید ہو سکتا ہے۔ ہم ایسے بے ایمان نہیں ہیں کہ لاکھوں نشانات دیکھ کر اور خدا تعالیٰ کے بے شمار وعدے پورے ہوتے دیکھ کر یہ خیال کریں کہ ہم دنیا کو فتح نہیں کر سکیں گے۔ بے شک ہم کمزور ہیں، ہمارے پاس ظاہری سامان نہیں، ہم میں طاقت نہیں لیکن دنیا کو ہم نے فتح نہیں کرنا بلکہ خدا تعالیٰ نے کرنا ہے اور اس کو سب طاقتیں حاصل ہیں۔ پس ہمیں مشکلات اور رکاوٹوں سے گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ خدا تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے پر پورا پورا وثوق ہونا چاہئے۔

اَب مَیں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ کل یہاں تک مضمون پہنچا تھا کہ انسان کو پاکیزگیٔ نفس اور طہارتِ قلب کس طرح میسّر ہو سکتی ہے اور کونسے ذرائع ہیں کہ انسان بلوغت کو پہنچ کر گناہ کو اپنے سے دُور رکھے اور نیکی حاصل کر سکے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دُنیا میں انسانی طبائع مختلف قسم کی ہیں۔ کوئی ادنیٰ ہے اور کوئی اعلیٰ۔ اس وجہ سے تمام فطرتوں کے لئے ایک قانون جاری نہیں ہو سکتا اور نہ ایک قسم کا علاج سب کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ دُنیا میں ہی دیکھا جائے تو ایک ہی بیماری کا سب کے لئے ایک علاج مفید نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے دیکھا ہے نزلہ ہوتا ہے تو ایک بیمار ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ قہوہ پی لے تو دو گھنٹہ میں اس کا نزلہ ہٹ جاتا ہے۔ اور کوئی دہی میں میٹھا ملا کر پی لے تو اسی سے اس کا نزلہ جاتا رہتا ہے مگر کئی انسان ایسے ہوتے ہیں کہ کئی دن میں علاج کرانے کے بعد اچھے ہوتے ہیں کئی ایسے ہوتے ہیں کہ حکیموں سے مشورہ لینے کی انہیں ضرورت پڑتی ہے اور کئی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی بیماری کے متعلق ڈاکٹروں کی عقلیں چکر میں آجاتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ مختلف لوگوں کو مختلف قسم کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کو مختلف قسم کے علاج سے افاقہ ہوتا ہے۔ یہی حال دیگر اُمور میں بھی ہے چونکہ انسانی قوتوں کے تفاوت کا انکار کرنا ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ علاج کے وقت لوگوں کے تفاوت اور استعدادوں کے اختلاف کو مدنظر رکھیں۔ اِسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مَیں گناہوں سے بچنے کا طریق بھی بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مَیں اس فطرت کو لیتا ہوں جو زنگ سے بالکل پاک ہوتی ہے اور جس میں طاقت ہوتی ہے کہ عقل سے کام لے سکے اور اعمال کو جاری رکھ سکے۔

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام میں پاکیزگی اس کا نام نہیں کہ زبان پر اچھی باتیں ہوں یا اعمال اچھے ہوں بلکہ اسلام میں اصل دل کی پاکیزگی ہے۔ جو انسان دل کا پاک نہیں وہ

خدا تعالیٰ کے نزدیک پاک نہیں ہے۔ ایک شخص قطعاً کوئی گناہ نہ کرے مگر اس کے دل میں گناہ اور بُرائی سے اُلفت ہو اور گناہ کے ذکر میں اُسے لذت محسوس ہو تو وہ نیک اور پاک نہیں کہلا سکی گا جب تک اس کے دل میں بھی یہ بات نہ ہو کہ گناہ میں ملوث نہ ہو۔ اِسی طرح کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ عادت کے ماتحت انہیں غصہ آتا ہے مگر گالی نہیں دیتے لیکن ان کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ فلاں انسان بڑا بدمعاش اور شریر ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق ہم یہ نہ کہیں گے کہ وہ پاکیزہ ہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ اپنے گند کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ پس اسلام میں پاکیزگی دل کی ہے۔ اعمال اور زبان تو آلات اور ذرائع ہیں جن سے پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ [۳۷] کہ جو دل کی حالت ہو وہ محاسبہ کے نیچے آتی ہے خواہ تم دل کی حالت کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ یہاں خدا تعالیٰ نے کیا عجیب نکتہ بیان فرما دیا کہ زبان اور اعمال تو دلی حالت کا اظہار کرتے ہیں۔ اصلی چیز دلی حالت ہے۔ خدا تعالیٰ اسی کا محاسبہ کرے گا۔ فرماتا ہے تم دلی حالت کو ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ یعنی تم اعمال گندے نہ کرو یا زبان سے ظاہر نہ کرو مگر تمہارے دل میں گند ہے تو ضرور پکڑے جاؤ گے دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۳۸]۔ کہ سب اعمال بجالاؤ۔ مگر نفس کو پاک کرو کیونکہ جس کے قلب میں بُرائی ہوگی وہ پکڑا جائے گا۔

یہ بات سمجھانے کے بعد کہ اصل نیکی دل کی پاکیزگی ہے اَب میں یہ بتاتا ہوں کہ جس فطرت پر زنگ نہ ہو اس کے لئے گناہوں سے بچنے کے تین علاج ہیں۔ (۱) یہ کہ اُسے بدیوں کا علم اور نیکیوں کی خبر ہو۔ خواہ دل ایک شخص کو کہتا ہو کہ نیکی کرو لیکن اگر نیکی کا پتہ ہی نہ ہو تو کیا کرے گا اسی طرح دل خواہ اُسے بُرائی سے باز رہنے کی تحریک کرتا ہو لیکن اُسے یہ علم ہی نہ ہو کہ فلاں فعل کا ارتکاب بُرائی ہے تو اس سے کس طرح بچ سکے گا۔ پس ضروری ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اُسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ خالی کسی فعل کے کرنے یا کسی فعل کے ارتکاب سے باز رہنے کی استعداد کافی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی شخص کی خواہش ہو کہ وہ اپنے دوست کو خوش کرے، مگر وہ دوست بتاتا نہیں کہ کس طرح خوش ہو سکتا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ پس سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ بدیوں کا علم اور نیکیوں کی خبر ہو۔

(۲) اسے معلوم ہو کہ بدیوں سے اجتناب اور نیکیوں پر عمل کرنے کے مواقع کیا کیا ہیں۔ یہ

ایسی بات ہے کہ نوکر کو کہیں فلاں اسباب اُٹھا کر اندر رکھ دو۔ نوکر رکھنے کے لئے مستعد ہو اور ہم نے اُسے کہہ دیا کہ رکھ دو لیکن اگر اُسے یہ پتہ نہیں کہ کہاں کہاں رکھنا ہے تو وہ میز کی جگہ کرسی اور کرسی کی جگہ میز رکھ دیگا یہی حال اس شخص کا ہو سکتا ہے جسے نیکیوں کے کرنے اور بدیوں سے بچنے کے مواقع کا علم نہ ہو۔ پس مواقع کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔

(۳) یہ معلوم ہو کہ کونسی بدیاں میرے اندر ہیں جنہیں مَیں نے دُور کرنا ہے۔ جب تک اِس بات کا علم نہ ہو وہ اپنا علاج کس طرح کر سکتا ہے۔ پس روحانی علاج کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ میرے اندر کیا کیا بدیاں ہیں اور کون کون سی نیکی کی کمی ہے تاکہ بدیوں سے بچوں اور نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اگر ایک شخص کے قلب میں زنگ اور تاریکی اور رُکاوٹ نہیں ہے تو اوپر کی باتیں معلوم ہونے پر وہ نیک ہو جائے گا۔ جب تک اپنی کمزوریوں کا علم نہ ہو کوئی انسان علاج نہیں کر سکتا۔ اور اگر معلوم ہو جائیں تو نہایت آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔

اَب میں اِن تینوں باتوں کی موٹی موٹی تشریح بیان کرتا ہوں۔ اوّل میں بدیوں اور نیکیوں کے علم کو لیتا ہوں۔ مَیں نے دیکھا ہے بہت لوگ ایسے موجود ہیں کہ اُن میں استعداد ہے کہ نیک ہو جائیں مگر انہیں بدیوں اور نیکیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ کئی لوگ مردوں میں سے بھی اور عورتوں میں سے بھی کہتے ہیں۔ کیا ہم میں (۱) فسق و فجور ہے (۲) ظلم ہے (۳) ہم لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں (۴) جھوٹ بولتے ہیں (۵) زنا کرتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر ہم میں کونسی بُرائی ہے۔ گویا جن میں یہ باتیں نہ ہوں وہ سمجھتے ہیں ان میں کوئی عیب نہیں ہے اور لوگ یہ پانچ عیب شرعی قرار دیا کرتے ہیں گویا اس سے زیادہ عیب نہیں۔ حالانکہ یہ لمبا سلسلہ چلتا ہے اور عیب سینکڑوں تک پہنچتے ہیں۔ اس وقت اِن سب کا بیان کرنا مشکل ہے۔ وقت کے لحاظ سے بھی اوریوں بھی کہ بعض عیب انسان کے علم سے اوپر ہوتے ہیں اور ایسا انسان جسے سب عیوب کا علم تھا وہ محمد ﷺ ہی کی ذات تھی اَور انسانوں کو بھی عیوب کی اِطلاع دی جاتی ہے مگر اسقدر علم کسی انسان کو نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے جس قدر رسول کریم ﷺ کو تھا۔

ایک دفعہ مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں ایک دوست کو سمجھا رہا ہوں کہ ورزش نہ کرنا بھی گناہ ہے مگر یوں ہم اسے گناہ نہیں کہتے۔ لیکن ایک انسان جس کی زندگی پر لاکھوں انسانوں کی زندگی کا مدار ہو اگر وہ اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کرتا تو وہ گناہ کرتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کون بہادر ہو سکتا ہے مگر جنگ میں آپ کی حفاظت کے لئے پہرہ ہوتا تھا اور آپ کے گھر پر

بھی پہرہ ہوتا تھا۔ کوئی کہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت دوسروں سے مقدم سمجھتے تھے مگر ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ آپ کی حیات سے دنیا کی زندگی وابستہ تھی۔ اگر آپ نہ ہوتے تو دنیا میں اسلام کس طرح قائم ہوتا؟ تو بعض انسانوں کا آرام اور صحت کا قائم رکھنا نیکی ہوتی ہے۔ اس کے خلاف کرنا گناہ ہوتا ہے۔ شیخ عبدالقادر صاحبؒ جیلانی ایک کتاب میں فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایسی حالت آتی ہے جب تک خدا مجھے نہیں کہتا کہ عبدالقادر اُٹھ تجھے میری جان کی قسم کھانا کھالے تو مَیں کھانا نہیں کھاتا اور جب تک وہ نہیں کہتا کہ میری جان کی قسم کپڑا پہن تو میں نہیں پہنتا [۳۹] اس کا یہی مطلب ہے کہ اس مرتبہ کے انسان کو خدا کہتا ہے کہ اپنی خاطر نہیں میرے لئے یہ کام کر، تو وہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سب کچھ خدا کے لئے کر رہا ہوتا ہے۔ پس گناہوں کے اس قدر مدارج ہیں کہ انسان کی حالت کے ساتھ ساتھ ان کی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے اسی لئے صوفیاء کہتے ہیں کہ ابرار کے گناہ عوام کی نیکیاں ہوتی ہیں۔

اَب میں موٹی موٹی تشریح بدیوں کی کرتا ہوں۔ اول وہ بدیاں جو ذاتی ہوتی ہیں یعنی جن کا اثر انسان کے اپنے نفس پر پڑتا ہے۔

(۲) وہ بدیاں جو دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی اُن کا اثر انسان کے اپنے نفس پر ہی نہیں پڑتا بلکہ دوسروں پر بھی اُن کا اثر ہوتا ہے۔

(۳) وہ بدیاں جو قومی ہوتی ہیں۔ یعنی قوم کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ بدی ہوتی ہے۔

(۴) وہ بدیاں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں نیکیوں کی بھی چار قسمیں ہیں (۱) ذاتی نیکیاں یعنی جن کا اثر انسان کی اپنی ذات پر پڑتا ہے۔ (۲) وہ نیکیاں جو دوسروں سے بھی تعلق رکھتی ہیں یعنی جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے (۳) قومی نیکیاں جو بحیثیت قوم نیکیاں سمجھی جاتی ہیں (۴) وہ نیکیاں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اَب مَیں اُن بدیوں کو بیان کرتا ہوں جو ذاتی بدیاں ہیں اور ان کی موٹی موٹی بدیوں کی لِسٹ دیتا ہوں تاکہ ان کے ذہن میں آنے سے ان سے بچنے کی طاقت پیدا ہو۔ ان سے آگے جو بدیاں ہیں وہ الہام کے ذریعہ بتائی جاتی ہیں۔

(۱) تکبر۔ یعنی اپنے نفس میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ کسی اَور پر ظاہر کئے بغیر ایک شخص اپنے نفس میں سمجھتا ہے کہ مَیں بڑا آدمی ہوں تو یہ بات اس کے نفس کو طہارت حاصل کرنے سے

روکتی ہے (۲) سفلہ پن۔ بازاروں میں آوارہ طور پر پھرنا یا بیٹھنا اور ذلیل پیشے اختیار کرنا۔ یہ بھی نفس کی بدی ہے اور اس کی وجہ سے بھی اعلیٰ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کوئی اپنی حالت اور پیشہ نہ بدلے گا۔

(۳) جلد بازی، کسی کام کو بے سوچے سمجھے جلدی میں اختیار کر لینا۔ اس کا نقصان بھی اختیار کرنے والے کو ہی پہنچتا ہے۔

(۴) بدظنی۔ یعنی دوسرے کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایسا ہے ویسا ہے خواہ اس پر اِس خیال کو کبھی ظاہر نہ کرے حتیٰ کہ مرجائے مگر پھر بھی یہ گناہ ہے۔

(۵) ناجائز محبت، خواہ دل میں ہی رکھے اور کسی کو نہ بتائے تو بھی یہ بدی ہے۔

(۶) کینہ، یعنی دل میں یہ خیال رکھنا کہ فلاں کو نقصان پہنچاؤں گا۔ چاہے عملاً کبھی بھی نقصان نہ پہنچائے۔

(۷) بزدلی۔ بزدلی کا دل میں پیدا ہونا گناہ ہے خواہ اُسکے اظہار کا کبھی موقع آئے یا نہ آئے۔

(۸) حسد۔ یعنی دوسرے کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کی چیز جاتی رہے اور مجھے مل جائے۔

(۹) بے صبری۔ یعنی مصائب پر گھبرا جائے اور جو کام اسے کرنا ہو وہ نہ کر سکے۔

(۱۰) دوں ہمتی، انسان اپنے لئے بڑے مقصد قرار نہ دے بلکہ چھوٹے چھوٹے قرار دے۔ یہ بُرائی بھی بڑی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ یہ خصوصاً بادشاہوں اور امراء کے لئے سخت تباہی کا باعث ہے۔ کیونکہ اُن کی کم ہمتی سے ان کی رعایا بھی کم ہمت ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں

تیرے منہ کی ہی قسم میرے پیارے احمد
تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے[۴۰]

یعنی تُو نے (محمد ﷺ) ترقی کی تو ہم بھی آگے بڑھے۔ پس امراء کے لئے دوں ہمتی بہت بڑا گناہ ہے اور عوام کے لئے بھی گناہ ہے۔

(۱۱) چاپلوسی۔ یونہی کسی کو خوش کرنے کے لئے باتیں بنانا چاپلوسی ہے۔ امراء کے نوکروں میں یہ بدی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

(۱۲) ناشکری۔ اس سے دل میں کسی کے احسان کی قدر نہ ہونا مراد ہے۔

(۱۳) بے استقلالی۔ ایک کام اختیار کرنا اور بغیر سرانجام دیئے چھوڑ دینا بے استقلالی ہے۔
(۱۴) سستی۔ اس کی وجہ سے انسان کام ہی نہیں کرتا۔
(۱۵) غفلت، (۱۶) حق کا انکار، (۱۷) حق کے اقرار کی جرأت کا فقدان۔
(۱۸) ناجائز نزاکت، یعنی وہ وجود جنہیں نزاکت نہ کرنی چاہئے، وہ کریں یا کوئی اس حد تک نزاکت کرے کہ عمل سے ناکارہ ہو جائے۔
(۱۹) جہالت۔ یعنی علم حاصل نہ کرنا۔
(۲۰) حرص۔ اس میں مبتلاء ہونا بھی بُرائی ہے۔
(۲۱) ریاء۔ یعنی لوگوں کو دکھانے کے لئے کام کرنا۔
(۲۲) بدخواہی۔ دل میں دوسرے کے نقصان کی خواہش رکھنا۔
(۲۳) ہمت ہار بیٹھنا۔ ذرا مشکل کا سامنا ہوا اور کام چھوڑ دیا۔ یہ بھی خاص طور پر امراء کی بدی ہے۔
(۲۴) بدی سے محبت۔ یعنی بدی کو دیکھ کر برا نہ منانا بھی گناہ ہے۔
(۲۵) ہر قسم کا نشہ بھی بدی ہے۔ اِس میں شراب، افیون، بھنگ، نسوار، چائے، حُقّہ سب چیزیں شامل ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو غذاء کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جیسے چائے ہے۔ اگر اس کی ایسی عادت ہو کہ چھوڑنے پر صحت پر اثر پڑے تو اس کا استعمال بھی بُرائی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت یہ ضرورت پیش آئے کہ انسان دُور دراز دیہاتوں میں تبلیغ کے لئے جائے اس وقت اگر سماوار وہ اٹھالے جائے اور چائے کا انتظام کرنا چاہے تو یہ ایسا بوجھ ہو گا جس کی وجہ سے وہ بہت مشکلات میں مبتلاء ہو گا۔ چونکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک مسلمان سپاہی بنے اور جہاں بھیجا جائے فوراً چلا جائے اس لئے وہ اس قسم کی عادتوں سے منع کرتا ہے جو رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہیں۔ میں نے کئی دفعہ سنایا ہے۔ ایک دفعہ ایک سفر میں ایک پٹھان کی نسوار ختم ہو گئی تو اس نے ایک کشمیری سے نہایت لجاجت کے ساتھ پوچھا کیوں بھئی تمہارے پاس نسوار ہے۔ یہ دیکھ کر مَیں نے کہا۔ نسوار نے اس کی گردن اس کے سامنے جھکائی ہے۔

یہاں کئی لوگ آتے ہیں جنہیں حُقّہ کی عادت ہوتی ہے پھر وہ اس کی وجہ سے کئی فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ابتداء میں ہمارے ایک رشتہ دار تھے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے سخت مخالف تھے۔ اور جو لوگ یہاں آتے وہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اپنے صحن میں چارپائیاں بچھا کر حُقّہ رکھ دیتے لوگ حُقّہ کو دیکھ کر جاتے اور وہ گمراہ کرنے کی کوشش کرتے اور کہتے ہم ان کے رشتہ دار ہیں اور ان کے حالات سے واقف اگر کوئی بات ہوتی تو ہم نہ مان لیتے۔ اس طرح کئی لوگوں کو ٹھوکر لگ جاتی۔ ایک دفعہ ایک احمدی آیا اور حُقّہ پینے ان کے پاس چلا گیا۔ اُسے پہلے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف باتیں سناتے رہے لیکن جب وہ خاموش بیٹھا رہا تو پھر اس کے سامنے حضرت مسیح موعود کو گالیاں بھی دیں۔ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولا۔ آخر اُسے کہنے لگے تم کس سوچ میں ہو کیوں کوئی بات نہیں کرتے؟ وہ کہنے لگا۔ مَیں اس سوچ میں ہوں کہ حُقّہ کی خبیث عادت مجھے یہاں لائی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مَیں نہ یہاں آتا اور نہ حضرت صاحب کے خلاف باتیں سنتا۔

اِس وقت مَیں ضمناً یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پہلے بھی کئی بار اس طرف توجہ دلا چکا ہوں کہ حُقّہ بہت گندی چیز ہے اِسی طرح دوسرے نشے بھی سخت مُضِر ہیں ان کو ترک کر دینا چاہئے۔ بعض نشے ایسے ہیں جن کی وجہ سے جھوٹ کی عادت پڑتی ہے۔ مَیں ان کے نام نہیں لیتا تا کہ جو ان کے عادی ہیں ان کے متعلق بد ظنی نہ پیدا ہو۔ مگر یہ بات بالکل سچی ہے بعض نشوں سے اعصاب پر خاص اثر پڑتا ہے اس لئے کسی نشہ کی بھی عادت نہیں ڈالنی چاہئے۔ مجھے کسی چیز کی عادت نہیں ہوتی۔ مجھے بچپن میں بیماری کی وجہ سے افیون دیتے تھے۔ چھ ماہ متواتر دیتے رہے مگر ایک دن نہ دی تو والدہ صاحبہ فرماتی ہیں مجھ پر نہ دینے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اِس پر حضرت صاحب نے فرمایا۔ خدا نے چھڑا دی ہے تو اَب نہ دو۔ تو مَیں ہر چیز جو استعمال کرتا ہوں اگر چھوڑ دوں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے چائے جس کا استعمال ہمارے گھروں میں ناشتہ کے طور پر ہوتا ہے کبھی کبھی پینا چھوڑ دیتا ہوں کہ عادت نہ ہو جائے۔ مؤمن کو کسی چیز کے نشہ کی عادت نہ ڈالنی چاہئے یہ بھی ایک بُرائی ہے۔

(۲۶) دوسروں کو حقیر سمجھنا۔

(۲۷) دلی عداوت۔ عداوت کا خواہ اظہار نہ کیا جائے اور دل میں رکھی جائے تو یہ بھی بُرائی ہے۔

(۲۸) دوسروں پر بے اعتباری کرنا۔ انسان دوسرے کے سپرد کوئی کام کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

(۲۹) طمع۔ یہ بھی قلبی بدی ہے۔

(۳۰) حد سے زیادہ غم کرنا بھی بدی ہے۔ یعنی انسان غم کو اتنا بڑھائے کہ اس کی عملی طاقتوں کو مضمحل کر دے۔

(۳۱) حد سے زیادہ خوشی بھی بدی ہے۔

(۳۲) بے تعلق باتوں میں دخل دینا۔ ایسی باتیں جن سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو خواہ مخواہ کود پڑنا بھی بدی ہے۔

(۳۳) ہلکا پن۔ جس سے مراد زیادہ باتیں کرنا ہے۔ جب کسی انسان کو زیادہ باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے تو وہ بے سوچے سمجھے جواب دیتا ہے۔

(۳۴) سنگ دلی۔ یعنی رحم نہ ہونا بھی ایک بدی ہے۔

(۳۵) دوسروں کو ایذاء رسانی میں لذت محسوس کرنا۔

(۳۶) اسراف (۳۷) خودکشی

(۳۸) وہ جھوٹ جس میں کسی کا نقصان نہ ہو۔ کئی لوگ بے فائدہ جھوٹ بولتے ہیں۔

اَب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دو قسم کی ہیں۔ اول وہ بدیاں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوم وہ بدیاں جو انسانوں کے سوا دوسری مخلوق سے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک دوست پوچھتے ہیں۔ حقّہ چھوڑنے کی ترکیب بتاؤ۔ حقّہ کی نسبت افیون چھوڑنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ایک دوست تھے جنہوں نے بہت سال افیون کھائی۔ جب وہ چھوڑنے لگے تو ڈاکٹر نے کہا۔ اگر چھوڑ دو گے تو مر جاؤ گے۔ مگر انہوں نے چھوڑ دی۔ اس پر چند دن انہیں تکلیف رہی مگر پھر ان کی صحت اچھی ہو گئی۔ نشے چھوڑنے کے کچھ علاج تو آگے بتاؤں گا۔ لیکن اس وقت مضمون کو خراب کئے بغیر جو بتا سکتا ہوں وہ یہی ہے کہ چھوڑ دو۔

وہ بدیاں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں وہ یہ ہیں:۔ (۱) بے ادبی۔ جن کا ادب کرنا ضروری ہو ان کا ادب نہ کرنا بھی بدی ہے (۲) ناجائز اظہار محبت (۳) بے وفائی یعنی آپ تو کام کراتے رہے لیکن جب دوست کو مدد کی ضرورت ہوئی تو جواب دے دیا (۴) چھچھورا پن۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ جلد غصہ میں آجانا۔ ناشائستہ اشارے کرنا۔ فوراً سزا دینے پر آمادہ ہو جانا۔ یونہی سزا دینے کی دھمکیاں دینا۔ مَیں نے کئی دفعہ قادیان کے دوبنیوں کا قصہ سنایا ہے۔ ایک دوسرے کو گالی دے رہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا کہ اَب گالی دو تو تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ اگر اُسے سر پھوڑنا تھا تو پہلی دفعہ گالی

دینے پر ہی چھوڑ دیتا۔ نئی گالی دلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر وہ ہر دفعہ یہی کہتا جاتا کہ اب گالی دو تو سر پھوڑ دوں گا۔ آگے سے دوسرا کہتا۔ سو دفعہ گالی دوں گا مگر دیتا نہ تھا۔ مَیں اس وقت آٹھ سال کا بچہ تھا اور اس نظارہ کو دیکھ کر وہاں کھڑا ہو گیا تھا مگر باوجود اس انتظار کے کہ ایک گالی دے اور دوسرا سر پھوڑے کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی اپنی دکان پر چلے گئے۔ اور اُس وقت ایک نے دوسرے کو پھر گالی دی اور دوسرا باہر آکر پھر کہنے لگا کہ اب گالی دو تو مزا چکھاؤں۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح کرتے رہے۔ یہ چھچھورا پن ہے۔ اور بزدلی کی علامت ہے اس طرح سزا میں حد سے زیادہ سختی کرنا بھی چھچھورا پن ہے یا ذرا کسی سے تکلیف پہنچی اور شور مچا دیا یہ بھی چھچھورا پن ہے۔

مَیں نے دورانِ تقریر میں سوال کرنے سے روکا ہوا ہے۔ مگر یہ مضمون چونکہ اہم ہے اِس لئے بعض سوالات جو دوستوں نے کئے ہیں اُن کے جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں ایک دوست پوچھتے ہیں کہ کونسے پیشے ذلیل ہیں۔ اس سوال کے ذریعہ وہ مجھے ایسی دلدل میں گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں جس میں مَیں جانا نہیں چاہتا۔ مگر مَیں اُن کو جواب نہ دینا بھی نہیں چاہتا۔ اس لئے بتاتا ہوں کہ وہ پیشے ذلیل ہیں جو انسان کی موجودہ حالت سے آئندہ ترقی میں روک پیدا کریں۔

ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ حُقّہ پینے والے کی وصیت منظور ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یہ چونکہ پیچیدہ سوال ہے اس لئے اس وقت اس کا جواب نہیں دیتا۔

ایک سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ طمع اور حرص میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طمع تو یہ ہے کہ انسان دوسرے سے اُمید رکھے کہ فلاں چیز مجھے دے دے۔ اور حرص یہ ہے کہ فلاں چیز مل جائے خواہ کہیں سے مل جائے۔

(۵) گالیاں دینا۔ اسے ہر جگہ کے لوگ بُرائی سمجھتے ہیں۔ لیکن پنجاب میں رواج ہے کہ بچہ سے کہتے ہیں کہ فلاں کو گالی دو اور جب وہ گالی دیتا ہے تو ہنستے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک معراج گالی دینا ہی ہے۔ یہ واقعہ مَیں نے خود بھی دیکھا ہے۔

(۶) لعنتیں ڈالنا (۷) بد دُعا۔ لعنت اور بد دُعا میں مَیں نے فرق کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بد دُعا انسان کی جسمانی حالت کے متعلق ہوتی ہے اور لعنت روحانیت کے متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ بد دُعا دیتا ہے کہ فلاں مر جائے تو یہ بد دُعا ہے اور جو کہتا ہے فلاں پر لعنت ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اُس کا دل ناپاک ہو جائے۔

مَیں اس سے وہ لعنت مستثنیٰ کرتا ہوں جو بد دُعا کے طور پر نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر ہوتی ہے اور وہ نبی کی طرف سے لعنت ہوتی ہے۔ وہ بد دُعا نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جس پر لعنت کی جاتی ہے اس کا دل ناپاک ہو گیا ہے۔

(۸) خیانت۔ کسی نے مال دیا۔ تو اُسے واپس نہ دیا یا پورا نہ دیا۔

(۹) افشاء راز۔ کسی کا کوئی راز معلوم ہوا تو اُسے ظاہر کر دیا۔ مگر یہ کبھی بدی نہیں بھی رہتی۔ مثلاً ایسے وقت میں جب کسی دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اُسے نقصان سے بچانے کے لئے راز افشاء کرنا بُرا نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کو معلوم ہو کہ ایک شخص کا ارادہ ہے کہ زید کو قتل کر دے۔ اب اگر زید کو یہ بات بتا دی جائے تو یہ بدی نہیں ہو گی بلکہ اس کا چھپانا بدی ہو گا۔ اِسی طرح حکومت کے خلاف کوئی سازش کرتا ہے اُسے بدنام کرتا ہے یا اُسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو جس کو یہ راز معلوم ہو اُس کا فرض ہے کہ ذمہ دار آدمیوں تک یہ بات پہنچائے۔

(۱۰) چغل خوری (۱۱) بشاشت سے نہ ملنا۔ اس سے دوسرے کے قلب پر بُرا اثر پڑتا ہے اور تعلقاتِ محبت قطع ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) ناواجب طرفداری۔ دو آدمی لڑ رہے ہوں اُن میں ایک دوست ہو تو اس کی بیجا حمایت کی جائے۔

(۱۳) دھوکا بازی (۱۴) بخل (۱۵) ظلم (۱۶) ظاہری ناشکری یعنی جس کا احسان ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کبھی احسان نہیں کیا۔

(۱۷) غلاظت (۱۸) غفلت، (۱۹) جھگڑا (۲۰) فساد۔ مَیں ان کی تشریح چھوڑتا ہوں کیونکہ لوگ یہ باتیں جانتے ہیں۔

(۲۱) شور مچانا۔ بازاروں میں کھڑے ہو کر شور مچانا یا اجتماع میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے شور پیدا کرنا۔ اور کام کرنے والوں کے کام میں حرج پیدا کرنا بھی ایک بہت بڑا عیب ہے۔ اہل یورپ کو مَیں نے دیکھا ہے اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مجالس میں جونہی ایک طرف سے خاموشی شروع ہو سب خاموش ہو جاتے ہیں اس لئے کہ جو خاموش ہو گئے انہیں ہماری آواز سے تکلیف نہ پہنچے۔

(۲۲) ایذاء رسانی (۲۳) جبر (۲۴) ڈاکہ، (۲۵) قتل (۲۶) چوری۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ اس کے متعلق ہی کوئی سوال آئے۔ چنانچہ ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ لوگ مراسمِ دوستانہ

کے طور پر چوری کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض گاؤں میں دستور ہے کہ ایک دوسرے کا مال چُرا لیتے ہیں۔ یہ بھی بُرائی ہے۔

(۲۷) مار پیٹ (۲۸) فخرِ بے جا (۲۹) بہتان لگانا (۳۰) غیبت کرنا (۳۱) عیب چینی کرنا۔ عیب چینی اور غیبت میں فرق ہے اور وہ یہ کہ غیبت کے معنے ہیں کسی کی بدی لوگوں میں بیان کرنا تا کہ وہ ذلیل ہو اور چغل خوری یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی شخص کوئی بُری بات بیان کرے تو اُسے جا کر بتانا اور ان کی آپس میں لڑائی کرانا۔

(۳۲) عیب لگانا (۳۳) تحقیر کرنا لوگوں میں ذلیل قرار دینا (۳۴) نام دھرنا جیسا کہ ہمارے ملک میں لوگوں کے مختلف قسم کے نام رکھ دیئے جاتے ہیں۔

(۳۵) استہزاء کرنا۔ یعنی حقیر اور ذلیل کرنے کے لئے ہنسی تمسخر کرنا۔

(۳۶) منہ چڑانا۔ بچوں اور عورتوں میں یہ بہت عادت ہوتی ہے۔

(۳۷) منصوبہ بازی کرنا۔ یعنی یہ سوچنا کہ فلاں کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔

(۳۸) تعذیب۔ یعنی بجائے سزا کے دُکھ دینا

(۳۹) غصہ ہونا۔ وہ غصہ جس کا اظہار کیا جائے۔

(۴۰) انتقام میں شدت۔ یعنی جتنا انتقام لینا چاہئے اس سے زیادہ لینا۔

(۴۱) رشوت لینا (۴۲) رشوت دینا (۴۳) سود لینا (۴۴) سود دینا۔ یہ موٹی موٹی بدیاں ہیں جو دوسرے انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اَب میں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں:۔

(۱) بدبودار چیزیں استعمال کرنا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ بدبودار چیزیں کھانے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ ایسے انسان کے پاس نہیں آتے۔

(۲) بِلا وجہ گھر میں کُتّا رکھنا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں جاتے۔[۱۴]

اَب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو دوسرے جانوروں سے تعلق رکھتی ہیں:۔

(۱) جانوروں کو بِلا وجہ مارنا

(۲) جانوروں سے زیادہ کام لینا۔ اس بُرائی میں عام طور پر زمیندار مبتلاء ہوتے ہیں۔ وہ جانور سے کام لیتے رہتے ہیں اور جب وہ کام دینے کے ناقابل ہو جاتا ہے اور مرنے لگتا ہے تو مذبح والوں

کے پاس بیچ دیتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ذبح کرنا ناجائز ہے بلکہ یہ کہ اس طرح کام لینا کہ وہ تکلیف سے کام کے ناقابل ہو جائے یہ ناجائز ہے۔

(۳) جانوروں کو کھانا کم دینا اور کام زیادہ لیتے رہنا۔ اس بُرائی میں زمیندار نہیں مبتلاء ہوتے دوسرے ہوتے ہیں۔ زمینداروں کو تو دیکھا ہے کہ وہ خود بھوکے رہیں گے مگر جانوروں کے چارے کا ضرور انتظام کریں گے۔ مجھے زمینداروں کا یہ فقرہ بہت پسند آتا ہے کہ جب قحط پڑتا ہے تو یہ نہیں کہتے۔ ہمارے کھانے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں چارہ نہیں ملتا۔

(۴) بیمار جانور کا علاج نہ کرنا۔

(۵) جانوروں کی تعذیب، داغ دینا۔ رسول کریم ﷺ نے ایک دفعہ دیکھا ایک گدھے کے منہ پر نشان لگا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا: یہاں مت لگاؤ کیونکہ اس جگہ حِس زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اگر نشان لگانا ہی ہے تو پیٹھ پر لگا دو۔[۴۲]

(۶) جانوروں کی سردی گرمی کا خیال نہ رکھنا۔

(۷) جانوروں کے شہوانی جذبات کا خیال نہ رکھنا۔ جانوروں میں بھی ایسے ہی قوی ہوتے ہیں جیسے انسانوں میں۔ اس لئے یا تو اُن کی شہوت دُور کرنے کا انتظام کرنا چاہئے یا کوئی اور تدبیر کرنی چاہئے۔

(۸) اولاد کی وجہ سے دُکھ دینا۔ یعنی اُن کے سامنے اُن کے بچوں کو ذبح کرنا یا بھوکے رکھنا یا اور کسی طریق سے دُکھ دینا۔

اَب مَیں تیسری قسم کی بدیاں بیان کرتا ہوں جو قومی بدیاں ہیں:۔

(۱) فحش کی اشاعت کرنا۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں یہ کہتا پھرتا ہے کہ فلاں شخص جھوٹا ہے تو یہ صرف دوسرے انسان سے تعلق رکھنے والی بدی نہیں بلکہ قومی بدی ہے۔ کیونکہ جس قوم میں یہ اعلان ہوتا رہے کہ اس میں جھوٹ بولنے والے بھی ہیں۔ اُس میں جھوٹ کی عظمت مٹ جاتی ہے اور اس میں یہ بدی پھیلنے لگتی ہے۔ میرے نزدیک فحش کی اشاعت خودکشی ہے۔

(۲) نفسانیت۔ جب قوم کے فوائد کے مقابلہ میں اپنے فوائد ٹکرائیں تو اپنے فوائد کو مدنظر رکھنا اور قومی فوائد کو نظرانداز کر دینا قومی بُرائی ہے۔

(۳) فسق و فجور۔ جیسے کنچنیوں کا پیشے بیٹھنا یا علی الاعلان شراب پینا۔

(۴) قومی فرائض کی ادائیگی میں سستی کرنا (۵) تربیت اولاد کی طرف توجہ نہ کرنا

(۶) تعلیم اولاد کی طرف توجہ نہ کرنا۔ جو لوگ اِن باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ قوم کو تباہ کرتے ہیں کیونکہ اولاد نے ہی آگے قوم بننا ہوتا ہے۔

(۷) غلاظت۔ یہ پہلے بھی بیان کی گئی ہے۔ وہاں اسلئے بیان کی گئی تھی کہ اس سے لوگوں کو بُو آتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن یہاں اس لئے اسے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے قوم تباہ ہوتی ہے۔

(۸) ذمہ داری کے احساس کا فقدان۔ فقدان کے معنے ہیں کسی چیز کا نہ پایا جانا۔ یعنی انسان یہ محسوس نہ کرے کہ میرے اُوپر جو کام تھا اس کا کرنا میرا فرض تھا۔

(۹) کام یا ذمہ داری کو پورا نہ کرنے اور نقصان ہو جانے کی صورت میں برداشت نہ کرنا۔ خواہ غلطی سے کام نہ کیا ہو یا جان بوجھ کر۔

(۱۰) بغاوت۔

ایک دوست نے ایک سوال کیا ہے۔ چونکہ مَیں خود بھی اس کے متعلق بیان کرنا چاہتا تھا اس اس لئے اسی موقع پر جواب دیتا ہوں۔ وہ دوست کہتے ہیں:۔ ہماری جماعت کو مخالفین کے مقابلہ میں درشت کلامی اور بد زبانی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ انہوں نے ہماری جماعت کے لیکچراروں اور واعظوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ سخت الفاظ استعمال نہ کیا کریں۔ مَیں بھی اس کے متعلق تاکید کرتا ہوں۔ وہ میری تحریروں میں کبھی ایسے الفاظ نہیں دیکھیں گے۔ کیا مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بد زبانی اور گالیاں سن کر رنج نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، لیکن مَیں نے کبھی درشت کلامی کے جواب میں درشت کلامی سے کام نہیں لیا۔ بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعض تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت صاحب بحیثیت مجسٹریٹ تھے اور ان کا فرض تھا کہ لوگوں کو اُن کی اصل حقیقت بتاتے۔ مگر ہماری یہ پوزیشن نہیں ہے اور درشت کلامی اور گالیاں دینا نفس کی کمزوری کی علامت ہے۔ آج کل ممکن ہے کسی کا اس سے دل خوش ہو جائے مگر آئندہ جو اولاد ہو گی وہ جب ان تحریروں کو پڑھے گی تو کہے گی۔ کاش! ہمارے باپ دادا ایسا نہ کرتے۔ کیونکہ وہ ٹھنڈے دل سے ان تحریروں کو پڑھیں گے۔ ان کو طیش نہ ہو گا۔ ان کے سامنے مخالفین کی تحریریں نہ ہوں گی۔ اس وقت وہ ان کتابوں اور اخباروں کو چھپاتے پھریں گے جن میں سخت اور درشت الفاظ ہوں گے۔

(۱۱) مہمانداری کے جذبہ کا نہ ہونا۔ یہ بھی قومی بدی ہے۔

(۱۲) تجارت میں فریب کرنا بھی قومی بدی ہے۔

حدیث میں آتا ہے رسول کریم ﷺ وعظ فرما رہے تھے کہ یکے بعد دیگرے لوگوں نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اس پر آپ کو جوش آگیا اور آپ نے فرمایا: کرو جس قدر سوال کرنا چاہتے ہو۔[۴۳] مَیں وعظ چھوڑتا ہوں۔ اب پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو مَیں قیامت تک کی باتیں بتاتا ہوں۔ اِسی طرح اس وقت میں کہتا ہوں۔ سوال پر سوال آ رہے ہیں۔ کیا مَیں لیکچر چھوڑ کر سوالوں کے جواب دینا شروع کر دوں۔ جو مضمون میں بیان کر رہا ہوں اس کے نوٹوں کے ابھی تک صرف پینتیس صفحے بیان کر سکا ہوں اور پچیس باقی ہیں۔ اگر مَیں نے سوالوں کے جواب دینے شروع کر دیئے تو مضمون کس طرح ختم ہو گا۔

مَیں یہ بیان کر رہا تھا کہ تجارت میں فریب کرنا بھی قومی بدی ہے۔ کیونکہ اس سے قوم کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ مَیں جب کشمیر گیا تو مَیں نے تحقیقات کی کہ چاندی کے برتنوں اور شال وغیرہ کی تجارت جو ایک کروڑ کی تھی لوگوں کی بددیانتی کی وجہ سے اب صرف سترہ لاکھ کی رہ گئی ہے۔

(۱۳) کارکنوں پر بے تعلق آدمیوں کے سامنے نکتہ چینی کرنا۔

(۱۴) بغیر کسی کا نام لئے قوم کی عام بدی کا اعلان کرنا۔ مثلاً یہ کہنا ہم میں بڑے فریب کرنے والے لوگ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

(۱۵) قومی اغراض میں مدد دینے سے دریغ کرنا۔

(۱۶) جن لوگوں سے قوم کو نقصان پہنچے اُن سے دوستی اور تعلق رکھنا۔

(۱۷) حکومت یا جماعت کے کارکنوں سے تعاون نہ کرنا۔

(۱۸) اطاعت کی کمی۔

اب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) بِلا وجہ قسم کھانا۔ مجسٹریٹ کے سامنے قسم کھانی پڑے یا کوئی اور ایسا اہم معاملہ ہو جس کے متعلق قسم کھانا ضروری ہو تو قسم کھا سکتا ہے ورنہ یونہی قسم کھانا گویا خدا تعالیٰ کے نام کی تخفیف کرنا ہے۔

(۲) مایوسی کہ اب میری مشکلات دُور نہیں ہو سکتیں۔ یہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

(۳) دل میں گندگی جمع کرنا۔ خدا تعالیٰ نے اس لئے دل پیدا کیا ہے کہ اُسے اپنا گھر بنائے

اِسی لئے دل بیت اللہ کہلاتا ہے اور جو دل کو خراب کرتا ہے وہ گویا خدا کو اس کے گھر میں آنے سے روکتا ہے۔

(۴) احکام شریعت کا انکار (۵) پانچویں بدی عقائد باطلہ ہیں مثلاً شرک وغیرہ۔

(۶) چھٹی بدی تمام عقائد حقہ کا انکار ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا، ملائکہ کا، رسولوں کا، الہام کا، بہشت کا، دوزخ کا انکار۔

(۷) ساتویں بدی احکام شریعت کا خواہ وہ عبادت کے متعلق ہوں یا تمدن کے متعلق توڑنا ہے۔ جیسے نماز نہ پڑھنا، حج نہ کرنا، ورثہ کے متعلق جو احکام ہیں ان کی تعمیل نہ کرنا، اخلاق کی پابندی نہ کرنا، کیونکہ جب ان احکام کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے تو اُن کو توڑنا گویا اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے۔ پس جس طرح اِن امور کی پرواہ نہ کرنے سے بندوں کو تکلیف ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی بھی ناراضگی ہوتی ہے۔

(۸) آٹھویں بدی خدا تعالیٰ سے محبت میں کمی ہے۔

(۹) نویں بدی خدا تعالیٰ اور رسول کی بے ادبی ہے۔

(۱۰) جس قدر بدیاں دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں وہ خدا تعالیٰ سے متعلق بھی ہیں۔ مثلاً ناشکری ہے۔ یہ انسانوں کے متعلق ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے متعلق بھی ہو سکتی ہے۔ اِسی طرح اور بھی کئی باتیں ہیں۔

اب مَیں نیکیاں بیان کرتا ہوں۔ پہلے ذاتی نیکیاں لیتا ہوں۔

(۱) شجاعت بہادری (۲) چستی (۳) علم سیکھنا (۴) تواضع (۵) غیرت یعنی کوئی بدی ہوتی دیکھے تو برا منائے (۶) شکر (۷) حسن ظنی (۸) دلی خیر خواہی (۹) محنت یعنی خوب کام کرنے کی عادت (۱۰) حیا (۱۱) رحم دلی کسی کی تکلیف دیکھ کر اس کے متعلق احساس ہونا (۱۲) استقلال یعنی نیکی کو جاری رکھنا (۱۳) وقار یعنی بے فائدہ اور بلا وجہ دوسروں کی کسی بات میں نقل نہ کرنا۔ ہمارے ملک میں یہ عیب بہت پایا جاتا ہے۔ جو بات انگریز کریں اس کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔ (۱۴) بلند ہمتی (۱۵) صبر (۱۶) حریت ضمیر یعنی بِلا وجہ کسی کی تقلید نہ کرنا (۱۷) شکر قلبی یعنی دل میں محسوس کرنا کہ فلاں نے احسان کیا ہے (۱۸) تحقیق حق یعنی سچائی کو تلاش کرنا (۱۹) کسی کی خوبی کا دلی اعتراف (۲۰) رأفت۔ رحمدلی اور رأفت میں یہ فرق ہے کہ رحمدلی تو یہ ہے کہ لوگوں کو تکلیف میں دیکھ کر مدد دینے کا خیال پیدا ہونا۔ اور رأفت یہ ہے کہ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر دُکھ محسوس

ہونا۔ (۲۱) اپنے حق کی خاطر مقابلہ کرنے کی قوت۔ یہ اَور بات ہے کہ کسی پر عفو کر کے کوئی اپنا حق چھوڑ دے۔ یا یوں اپنی سُستی سے مٹ لے، لیکن کسی سے دب کر حق نہیں چھوڑنا چاہئے۔

(۲۲) سباق کی قوت یعنی یہ طاقت کہ نیکیوں میں دوسروں سے آگے نکلوں۔

(۲۳) اپنی ہزیمت اور شکست تسلیم نہ کرنا۔ خواہ کئی دفعہ ہارے، مگر اپنی ہار نہ مانے۔ یہ مطلب نہیں کہ منہ سے اقرار نہ کرے بلکہ اِس پر راضی نہ ہو۔ اور اس کے اثر کو دُور کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

(۲۴) چوکس رہنا یعنی اپنے دشمن سے غافل نہ ہونا (۲۵) اقرار حق (۲۶) قوت برداشت کا ہونا یعنی تکلیفیں برداشت کرنے کی طاقت ہونا (۲۷) جفاکشی کا عادی۔ خواہ کتنا کام آپڑے گھبرائے نہیں (۲۸) جرأت (۲۹) نیکی سے محبت (۳۰) لوگوں کی مدد کی خواہش کہ اگر موقع ملے تو ضرور مدد کروں۔ (۳۱) سادہ زندگی بسر کرنا۔ اپنے نفس کی آسائش پر روپیہ زیادہ صرف نہ کرنا (۳۲) اپنی عزت کی حفاظت کرنا، (۳۳) دوسروں کی خوبیوں کا اقرار کرنا، (۳۴) ہر بات میں میانہ روی اختیار کرنا۔

اَب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں۔

فرشتوں سے تعلق رکھنے والی نیکیاں یہ ہیں:۔ (۱) ذکر الٰہی۔ لکھا ہے کہ جہاں ذکر الٰہی ہوتا ہے وہاں فرشتے ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ وہاں فرشتے گھیرا ڈال لیتے ہیں۔[۴۴] (۲) طہارت ظاہری۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ملائکہ کے نزول کے مواقع ہوتے ہیں وہاں خوشبو لگا کر جانے کا حکم ہے۔ جیسے جمعہ کے لئے نہانا اور خوشبو لگانا مسنون ہے۔[۴۵]

اَب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) عدل (۲) احسان (۳) احسان کا شکریہ (۴) صفائی پسندی (۵) سخاوت (۶) وفاداری (۷) رحم کرنا عملاً (۸) دوستانہ (۹) حلم۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کے جو نیک پہلو ہوں ان کو سوچ کر چھوڑ دینا۔ عفو تو یہ ہے کہ قصوروار سمجھ کر معاف کر دینا۔ مگر حلم یہ ہے کہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے درگزر کرنا۔ (۱۰) ایثار (۱۱) قرض روپیہ دینا (۱۲) صدقہ (۱۳) تعاون (۱۴) دیانت (۱۵) صلح جوئی یعنی صلح کی کوشش کرنا۔ (۱۶) عفو یعنی معاف کر دینا۔ (۱۷) عہد کی پابندی (۱۸) گرے ہوئے لوگوں کو بلند کرنے کی کوشش کرنا (۱۹) دوسروں کا اعزاز اور اکرام کرنا (۲۰) دوسروں کا ادب کرنا۔ اعزاز تو یہ ہے کہ جو برابر کا ہے اس کی عزت کرنا

اور ادب یہ ہے کہ بڑوں کا احترام کرنا۔ (۲۱) اگر لوگوں میں لڑائی ہو تو اُن کی صلح کرانا۔ (۲۲) اخوت (۲۳) رازداری (۲۴) بشاشت۔

اَب مَیں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو دوسرے جانوروں سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) ان کی غذا کا خیال رکھنا (۲) ان کی طاقت کے مطابق ان سے کام لینا (۳) جن جانوروں سے کام نہ لیا جائے ان کو بھی کھانا دینا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ ایک دفعہ کئی دن تک بارش ہوتی رہی اور پرندوں کو دانہ نہ ملا۔ ایک شخص نے ان کو دانہ ڈالا۔ اس وجہ سے اُسے ایمان نصیب ہوا اور وہ جنت میں چلا گیا۔[۴۶] قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔[۴۷] مؤمنوں کی یہ بھی صفت ہے کہ ان کے مال میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے جو مانگ سکتے ہیں اور جو نہیں مانگ سکتے ان کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ نہ مانگ سکنے والوں میں حیوانات اور پرند شامل ہیں اُن کو بھی کھانے کے لئے دینا چاہئے۔ (۴) بے زبان جانوروں کی سردی گرمی اور اُن کے شہوانی جذبات اور ان کی اولاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اَب مَیں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو قومی نیکیاں ہیں۔

(۱) زکوٰۃ دینا (۲) ضروریات قومی کے لئے چندہ دینا (۳) مہمان نوازی کرنا (۴) خدمت قومی کرنا (۵) اطاعت حکام (۶) حکام سے تعاون کرنا (۷) حفاظت ملک کرنا (۸) ذمہ داری کا احساس (۹) غلطی پر خوشی سے سزا بُھگتنا (۱۰) اشاعت حسنات یعنی لوگوں کی نیکیاں پھیلانا (۱۱) دشمنان قوم سے اجتناب کرنا (۱۲) قومی عزت کی حفاظت کرنا۔ قوم پر اگر کوئی حرف لاتا ہو تو اس کی تردید کرنا۔ (۱۳) تجارت میں ایمانداری اور دیانتداری اختیار کرنا (۱۴) تعلیم دینا (۱۵) تربیت کرنا۔

اَب مَیں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) ایمان میں کامل ہونا (۲) محبت الٰہی (۳) اعمال شریعت عبادات اور معاملات کو پورا کرنا۔ (۴) رجاء یعنی خدا تعالیٰ پر اُمید رکھنا (۵) خوف یعنی خدا تعالیٰ کی عصمت سے خوف رکھنا (۶) دلی پاکیزگی (۷) توکل یعنی باوجود اپنی طرف سے کوشش کرنے کے یہ احساس ہونا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی نصرت آئے گی تب کامیابی ہوگی۔ (۸) اخلاق حسنہ سے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اُنکا خیال رکھنا۔ جیسے عہد کی پابندی وغیرہ ہے۔ (۹) تمام عقائد باطلہ کا رد کرنا (۱۰) اللہ تعالیٰ کی شان میں اگر کوئی شخص بے ادبی کرے مثلاً کہے اُس نے مجھے کیا دیا ہے۔ مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے تو اُسے سمجھانا کہ یہ خدا تعالیٰ کے ادب کے خلاف ہے اس سے باز رہو۔ (۱۱) تبلیغ حق۔ شعائر

اللہ کا ادب۔

اَب مَیں دوسرے سوال کو لیتا ہوں کہ کونسے مواقع ہیں کہ جن میں ان اعمال کو برتا یا ترک کیا جائے۔ اس کے جواب دو ہیں ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اگر تفصیلی جواب بیان کرنا چاہوں اور اس میں بھی اختصار سے کام لوں تب بھی کم از کم پندرہ بیس گھنٹے چاہئیں اس لئے مَیں اجمال کو لیتا ہوں اور موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہوں۔

(۱) وہ حق جو اللہ تعالیٰ کے بندے پر ہیں اس وقت تک اُن کو ترک نہ کرے جب تک مجبور نہ ہو جائے یا خدا تعالیٰ کا کوئی دوسرا حکم اُن سے روک نہ دے۔ مثلاً ہاتھ یا منہ پر زخم ہے اِس وجہ سے وضو نہیں کر سکتا یا ہاتھ ہی نہیں اس لئے اُسے دھو نہیں سکتا۔ یہ مجبوری ہے۔ اور دوسرا حکم مقابلہ میں آجانے کی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے عورت پردہ کرے لیکن یہ بھی خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ حج کے موقع پر خانہ کعبہ میں پردہ اٹھا دینا چاہئے۔ یہ دوسرا حکم پہلے کے مقابلہ میں آگیا اور اس کی وجہ سے خانہ کعبہ میں پردہ نہ کرنا ہی نیکی ہے۔ یا مثلاً حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ یہ نیکی ہے لیکن اگر ماں باپ کا کوئی حکم خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آجائے تو اس وقت اُس کا نہ ماننا ہی نیکی ہوگی۔

(۲) دوسرے کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کرے کہ جس کا ویسے ہی حالات میں کرنا اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو مَیں اس میں ایک شرط لگاتا ہوں اور وہ یہ کہ مَیں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے سے وہ معاملہ کرے جو یہ پسند کرتا ہو۔ بلکہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ کوئی بات دوسرے کے ساتھ ایسی نہ کرے جسے ویسے ہی حالات میں اپنے لئے پسند نہ کرے یا دوسرے کے ساتھ وہ سلوک نہ کرے جو ویسے ہی حالات میں اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو۔ انجیل کا حکم ہے کہ تُو دوسرے کے ساتھ ویسا ہی سلوک کر جیسا اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ مگر یہ حکم صحیح نہیں ہے۔

(۳) افراط و تفریط کا خیال رکھے۔ بعض لوگ ہوتے ہیں وہ یا تو نفل پڑھنے ہی چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اتنے پڑھتے ہیں کہ گھر بار کی فکر ہی نہیں کرتے۔ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی کے متعلق شکایت آئی کہ وہ دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو نفل پڑھتا رہتا ہے۔ آپ نے اُسے بلا کر فرمایا:۔ وَ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ۔ کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اُسے بھی ادا کرنا ضروری ہے۔

(۴) انسان اس رنگ میں عمل کرے کہ خدا تعالیٰ کی صفت کے ظہور سے ویسا ہی رنگ پیدا

ہو جائے۔

اَب مَیں تیسرے سوال کو لیتا ہوں جو یہ ہے کہ کس طرح معلوم ہو کہ کونسی بدیاں انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے کئی ذرائع ہیں:۔ (۱) محاسبہ نفس ہے۔ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدیاں ہیں۔ یہ نیکیاں ہیں۔ تو پھر وہ غور کرے کہ ان میں سے کونسی بدی ہے جو اس میں پائی جاتی ہے یا کونسی نیکی ہے جو نہیں پائی جاتی۔ (۲) اپنے کسی گہرے اور دلی دوست سے کہے کہ وہ اس کے نفس کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ کبھی انسان اپنا عیب آپ معلوم نہیں کر سکتا اس لئے دوست سے کہے کہ وہ اس کے اعمال ظاہری کا مطالعہ کرے۔ یہ نہ کہے کہ تم میرے متعلق بدی کے لئے تجسّس اور تلاش کرو یہ گناہ ہے بلکہ کہے کہ جو ظاہر اعمال ہیں اُن میں جو نقص ہو وہ بتاؤ اِس طرح جو نقص وہ آپ معلوم نہ کر سکتا تھا اُسے دوست بتا دے گا مگر پھر بھی دوست دوست ہی ہوتا ہے کئی عیب وہ بھی چھوڑ دے گا اس لئے تیسرا طریق یہ اختیار کرنا چاہئے کہ جو عیب اُسے دوسروں میں نظر آتے ہوں اُن کے متعلق دیکھے کہ وہ مجھ میں تو نہیں پائے جاتے؟ مَیں بھی تو انہی افعال کو نہیں کرتا یا یہ کہ دوسروں میں جو نیکیاں نظر آئیں اُن کے متعلق دیکھے کہ مجھ میں ہیں یا نہیں؟ (۴) اس سے بھی بڑھ کر ایک اَور بات ہے اور وہ یہ کہ دیکھے دشمن اُس پر کیا عیب لگا رہے ہیں؟ اور پھر سوچے کہ وہ عیب اس میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ کئی عیب اس طرح معلوم ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ بھی دیکھے کہ دشمنوں کو مجھ میں کونسی نیکیاں نظر آتی ہیں کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیکیوں کا اعتراف کرنے کے لئے دشمن بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

(۵) بہت اہم اور بہترین ذریعہ بدیوں اور نیکیوں کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم کرتے وقت جہاں وہ عیب پڑھے جو خدا تعالیٰ نے پہلی قوموں کے بیان کئے ہیں وہاں غور کرے کہ مجھ میں بھی تو یہ عیب نہیں۔ اسی طرح جہاں قرآن کریم میں کسی نیکی کا ذکر آئے وہاں دیکھے کہ مجھ میں یہ نیکی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اِس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ چونکہ سب نیکیاں اور بدیاں ایک وقت میں انسان کے سامنے نہیں آسکتیں اس لئے آہستہ آہستہ تلاوت کے وقت آتی رہیں گی۔ دوسرے تلاوت کے وقت چونکہ خشیۃ اللہ پیدا ہوتی ہے اس لئے بدیوں سے بچنے اور نیکیاں اختیار کرنے میں بھی اسے بہت مدد ملے گی۔

جو بدیوں کا علم ہو کر بھی انہیں نہیں چھوڑ سکتے ، اُن کا علاج

یہ باتیں ان لوگوں کے متعلق ہیں جن کے دلوں پر بدیوں کی وجہ سے زنگ نہ لگ چکا ہو۔ مگر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں بدیوں کا علم ہوتا ہے مگر باوجود اس کے وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ان کا کیا علاج ہے؟ مثلاً ایسے لوگ ہیں جنہیں پتہ ہے کہ نماز نہ پڑھنا گناہ ہے مگر نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ قتل کرنا گناہ ہے مگر چھوڑ نہیں سکتے۔

اس سوال کا ایک تفصیلی جواب ہے مگر نہ وہ اس وقت لیکچر میں بیان ہو سکتا ہے اور نہ کسی چھوٹی موٹی کتاب میں لکھا جا سکتا ہے۔ پس مَیں دس پندرہ نکتے اس سوال کے جواب میں اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں۔

(۱) ایسے انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے دل پر زنگ لگ گیا ہے اور کوئی روک پیدا ہو گئی ہے جو اُسے نیکی نہیں کرنے دیتی اور بدی سے بچنے نہیں دیتی اور یہ شامتِ اعمال ہے یعنی پچھلے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے لئے پہلا علاج یہ ہے کہ استغفار کر کے خدا تعالیٰ سے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگے۔

استغفار کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے معنے پردہ ڈالنے کے ہیں اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حالت میں تو استغفار یہ ہوتا ہے کہ استغفار کرنے والا کہتا ہے کہ خدایا! ان گناہوں کو جو مَیں کر چکا ہوں مٹا دے یا جن میں گرفتار ہوں ان کو دُور کر دے اور دوسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے، الٰہی! مجھ میں گناہ پیدا ہی نہ ہو۔ جب انبیاء کے متعلق استغفار آتا ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گناہ کبھی پیدا ہی نہ ہو۔

(۲) دوسرا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے اندر معرفت پیدا کرے۔ معرفت کے یہ معنے ہیں کہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے دل پر جاری کر کے صفات الٰہیہ کا مطالعہ کرے اور ان کو جذب کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کی رحمانیت کو دیکھے کہ اُس نے مجھ پر کتنے احسان کئے ہیں اور جب وہ کہتا ہے کہ میرے بندوں کو اپنے مال سے دو تو مَیں کیوں نہ دوں۔ اِس طرح خدا تعالیٰ کی صفات پر غور کرنے سے بدیوں سے بچنے اور نیکیاں کرنے کا ملکہ پیدا ہو گا۔

(۳) نیکی کے نیک انجام اور بدی کے بد انجام پر غور کرے۔ یعنی یہ دیکھے کہ فلاں نے نیکی کی تو اُسے یہ فائدہ پہنچا اور فلاں نے بدی کی تو اُسے یہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے بھی عرفان حاصل

ہوتا ہے۔

(۴) جب یہ تینوں باتیں کرلے تو چہارم یہ کرے کہ توبہ کرے۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے (۱) گذشتہ گناہوں پر ندامت۔ یہ حالت دل میں پیدا ہو۔ (۲) جو فرائض ادا کرنے سے رہ گئے ہوں وہ ادا کرے۔ مثلاً حج رہ گیا ہے وہ کرے۔ مگر نماز ایک ایسا فرض ہے کہ وہ رہا ہوا پھر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے استغفار ہی ہے۔ (۳) جو گناہ خدا نے چھپائے ہوئے ہوں یعنی جن پر خدا تعالیٰ نے پردہ ڈالا ہو اُن کے علاوہ جس جس کے گناہ یاد ہوں اس سے معافی مانگے۔ (۴) جن کو اس سے نقصان پہنچ چکا ہو ان کو فائدہ پہنچائے یعنی اُن سے حسن سلوک کرے۔ (۵) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرے۔ (۶) نفس کو نیکی کی طرف راغب کرے۔

یہ توبہ کی شرطیں ہیں ان کو بجالائے تب توبہ حقیقی توبہ کہلا سکے گی اور منظور ہوگی۔

(۵) انسان تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ [۸] کی حالت پیدا کرے۔ یہ نہ خیال کرے کہ اخلاص نہیں ہے بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر نیک کام کرتا ہی جائے۔ مثلاً صدقہ دینے پر تکلیف ہو تو دیتا ہی رہے یا نماز میں توجہ نہ قائم رہے تو بار بار پڑھتا رہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کا فرض یہی ہے کہ کام میں لگا رہے اور ہمت نہ ہارے۔ مَیں نے کئی دفعہ سنایا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے۔ ایک مرید اپنے پیر کو ملنے کے لئے آیا اور انہیں کے پاس ٹھہر گیا۔ رات کو پیر صاحب دُعا کرتے رہے کہ الٰہی فلاں کام ہو جائے۔ آخر آواز آئی یہ کام تو نہیں ہو گا۔ یہ آواز مرید نے بھی سُن لی۔ اس پر وہ حیران ہوا کہ اچھے پیر صاحب ہیں ہم تو ان سے دُعا کرانے کے لئے آتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ جواب ملتا ہے کہ تمہاری دُعا منظور نہیں کی جائے گی۔ خیر وہ چپکا ہو رہا۔ دوسرے دن پھر اُسی طرح ہوا کہ پیر صاحب ساری رات دُعا کرتے رہے۔ آخر انہیں پھر وہی جواب ملا۔ مرید اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ تیسرے دن پھر اسی طرح ہوا۔ آخر مرید نے انہیں کہا۔ تین دن سے آپ کوئی دُعا کر رہے ہیں جس کے متعلق الہام ہوتا ہے کہ نہیں سنی جائے گی پھر کیوں آپ دُعا کرتے چلے جاتے ہیں۔ پیر صاحب نے کہا۔ نادان! مَیں تو بیس سال سے یہی دُعا کر رہا ہوں اور مجھے یہی الہام ہو رہا ہے مگر مَیں نہیں گھبرایا اور تُو تین دن جواب سن کر گھبرا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کا کام قبول کرنا یا نہ کرنا ہے اور میرا کام دُعا مانگنا ہے۔ وہ اپنا کام کر رہا ہے اور میں اپنا کام کر رہا ہوں۔ لکھا ہے اِس پر معاً الہام ہوا کہ اس عرصہ میں تم نے جتنی دُعائیں کی ہیں سب قبول کی گئیں۔

پس بندہ کا کام یہ ہے کہ اپنے کام میں لگا رہے۔ نماز میں اگر توجہ قائم نہیں رہتی تو نہ رہے یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ نماز نہ چھوڑے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان ظاہر میں نیکی کرتا ہے تو اس کا اثر باطن پر پڑتا ہے اور انسان پاک ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس طرح بھی کامیابی نہ ہو انسان ارادے کرتا رہے لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جائیں۔ اُٹھتا رہے مگر پھر گر گر جائے۔ ہمت کرتا رہے مگر ناکامی کا منہ دیکھنا ہی نصیب ہو۔ ایسے انسان کو یقیناً سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے دل پر بہت زنگ لگ گیا ہے اور اس کے دُور کرنے کے لئے تفصیلی علاج کی ضرورت ہے کیونکہ اس پر نفس غالب آچکا ہے اور وہ مغلوب ہو گیا ہے اور وہ احساسِ انانیت جس کی طرف میری اس نظم میں جو کل پڑھی گئی اشارہ کیا گیا ہے وہ مٹ گیا ہے اور وہ اس جانور کی طرح ہو گیا ہے جسے انسان نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ اُس کا نفس بھی اُسے نکیل ڈالے لئے پھرتا ہے۔ پس اس کے لئے پہلے تو اجمالی اصولی علاج اور پھر تفصیلی اصولی علاج بیان کرتا ہوں۔ مگر پیشتر اس کے کہ مَیں اس کے متعلق کچھ کہوں اس فلسفۂ اخلاق میں جو پہلے سمجھا جاتا تھا اور اس میں جو احمدی نقطۂ نگاہ سے اب سمجھا جاتا ہے فرق بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں میں فلسفۂ اخلاق کے بانی ابنِ مردویہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے اور بعد میں ابن عربی سب سے بڑے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بعد امام غزالی ہوئے جنہوں نے اخلاق پر ایک چار جلد کی کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد کوئی کتاب نہ لکھی گئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ فلسفہ اخلاق ختم ہو گیا۔ اس وجہ سے مَیں اس کے متعلق روشنی ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ وہ لوگ جو اس فلسفہ کی کتابیں پڑھتے ہیں اُن پر وہ غلطیاں ظاہر ہو جائیں جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ بے شک وہ باتیں اپنے وقت میں اچھی تھیں مگر اب ان میں غلطیاں ہیں۔

امام غزالیؒ کے فلسفہ اور احمدی فلسفہ میں فرق یہ ہے کہ امام غزالی نے صفاتِ سلبیہ پر بڑا زور دیا ہے۔ لیکن احمدی فلسفہ اخلاق جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا ہے اس نے اس میں بڑا تغیر کر دیا ہے۔ کیونکہ آپ نے صفات ایجابیہ پر زور دیا ہے۔ یعنی آپ نے یہ فرمایا ہے کہ اخلاق یہ نہیں کہ یہ نہ ہو وہ نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو۔

اِس میں شبہ نہیں کہ نفس کشی بھی علاج ہے مگر وہ ایک علاج ہے نہ کہ وہی علاج ہے ہم فلسفۂ اخلاق پر بحث کرتے ہوئے مندرجہ ذیل باتیں نہیں بھول سکتے۔ اول خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ کہ ہم نے انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے

کہ عبادت کرے۔ پھر فرماتا ہے۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ [۴۹] کہ انسان کو کبھی ختم نہ ہونے والی نعماء کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ بعض باتیں نہ کرے بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ کرے۔ چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ فلاں کام نہ کرے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ہم نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ عبادت کرے۔ پس ہم دنیا میں کام کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ اس لئے کہ کچھ نہ کریں۔ نفی بطور پرہیز کے ہوتی ہے یعنی مقصد کے حصول میں جو روکیں ہیں اُن کو الگ کر دو۔ لیکن مقصد نفی نہیں ہوتا۔ اگر پیدائش انسانی کی غرض نفی ہوتی تو اس کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ غرض تو اس کے پیدا نہ ہونے کی صورت میں زیادہ اچھی طرح پوری ہو رہی تھی۔ یہ غرض تو ایسی ہے جیسے ہندوؤں کے خدا کی تعریف کہ وہ یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو نفی کے لئے نہیں بلکہ اثبات کے لئے پیدا کیا ہے۔ گو نفی بطور پرہیز کے شامل ہو۔ پس اصل بحث یہ ہے کہ انسان کیا کیا بنے نہ یہ کہ کیا کیا نہ بنے۔

دوسری بات جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ نفس کی مثال گھوڑے کی سی ہے بے شک گھوڑے کو ورزش کرانی چاہئے اور اتنا ڈبلا رکھنا چاہئے کہ خواہ مخواہ سوار کو نہ گرا دے مگر کیا کوئی شخص ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ گھوڑے کو ڈبلا کر کر کے سوار بن گیا ہو۔ ایک سفر میں ایک دوست جو سوار نہ تھے کہنے لگے۔ مَیں گھوڑے پر سوار نہیں ہونگا۔ اگر سوار کرانا ہے تو کوئی ڈبلا گھوڑا لاؤ۔ اُن کے کہنے پر ایک ڈبلا گھوڑا لایا گیا تو وہ اُس سے بھی خوف ہی ظاہر کرتے رہے اور کہنے لگے کہ کیا اس سے ڈبلا اور چھوٹا کوئی گھوڑا نہیں؟ پس اگر سواری نہ آتی ہو تو گھوڑے کو ڈبلا کرنے سے نہیں آسکتی۔ اس لئے نفس کو ڈبلا کر کے یہ سمجھنا کہ ہم اس پر قابو پالیں گے اور پھر جس طرح چاہیں گے اُسے چلائیں گے ایک وہم ہے۔ صرف نفس کے ڈبلا کرنے سے نہیں بلکہ اُس پر قابو پانے کا ہنر سیکھنے سے نفس پر قابو ہو گا۔

تیسری بات جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ گناہ نفس کے قبضہ میں آجانے سے ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس کے مرجانے سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً بے غیرتی ہے۔ یہ نفس کے مر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر تو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ نفس میں طاقت پیدا کی

جائے تاکہ وہ ایسے موقع پر کام کر سکے۔

غرض جس طرح کام لینے کے لئے گھوڑے کو کبھی دُبلا کیا جاتا ہے اور کبھی موٹا بھی۔ یہی حالت نفس کی ہے۔ نہ تو اسے بالکل مار دینا چاہئے اور نہ اتنا سرکش بنا دینا چاہئے کہ کوئی بات ہی نہ مانے۔

فلسفہ اخلاق کے متعلق غزالیؒ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بتائے ہوئے طریق میں یہ فرق بھی ہے کہ آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایمان کی بناء رجاء اور اُمید پر ہے۔ یہ تو قرآن کریم میں آتا ہے کہ طمع اور خوف کے درمیان ایمان ہوتا ہے۔[۵۰] مگر یہ نہیں آتا کہ اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان ایمان ہوتا ہے۔ نا امیدی کے متعلق تو یہاں تک آیا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ[۵۱] کہ نا اُمید کافر ہی ہوتا ہے مؤمن نہیں ہوتا۔ تو ایمان کا فلسفہ اُمید پر قائم ہے اور حدیث میں آتا ہے جیسا بندہ گمان کرے گا ویسا ہی خدا تعالیٰ اس سے سلوک کرے گا۔[۵۲] پس ایسی کوئی ترکیب کہ جس سے ناامیدی پیدا ہو اسلام نہیں کہلا سکتی۔ مگر خوف کے متعلق بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ طمع سے کم ہو اور طمع خوف کی نسبت زیادہ ہو۔ بے شک خوف ایمان کا حصہ ہے مگر طمع سے کم ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۔[۵۳] کہ میری صفت رحمت غضب کی صفات سے زیادہ وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کے دل میں بھی خوف سے طمع کی حالت زیادہ زوردار ہونی چاہئے۔

مؤمن کا دل امید سے پُر ہوتا ہے۔ بیشک اُسے خوف بھی ہوتا ہے مگر کم۔ وہ سمجھتا ہے خدا تعالیٰ مجھ سے ایسا معاملہ نہ کرے گا کہ مَیں تباہ ہو جاؤں۔ اگر ہم مؤمن کے خوف اور امید کو دیکھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خوف خدا تعالیٰ پر بدظنی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی امید خدا تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب کیا یہ سچ نہیں کہ ہماری کمزوری خدا تعالیٰ کے فضل کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ پس اگر مؤمن کا خوف خدا تعالیٰ کی بے نیازی کو مدنظر رکھ کر ہو تو اس کی رحمت اس کی بے نیازی پر غالب ہے اور اگر اپنی کمزوری کو دیکھ کر ہو تو خدا تعالیٰ کی طاقت ہماری کمزوری پر غالب ہے۔ پس بہرحال اُمید کا پہلو ہی غالب رہا کیونکہ اس کا محرک خوف کے محرک سے ہر طرح زبردست ہے۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ امید مُطیع کے لئے ہوتی ہے باغی کے لئے نہیں ہوتی۔ کوئی انسان یہ نہ کہے کہ جو جی چاہے گا کریں گے اور پھر امید رکھیں گے کہ خدا کی رحمت کے مستحق ہو جائیں

گے۔ یہ بغاوت ہے اور باغی کے لئے کوئی امید اور طمع نہیں ہو سکتی۔ طمع مطیع کے لئے ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھنی چاہئے کہ مؤمن کے خوف کا موجب یہ نہیں ہوتا کہ شاید یہ بات نہیں ہو سکے گی یا یہ کہ ایسا نہ کیا تو سزا ملے گی بلکہ اُسے یہ خوف ہوتا ہے کہ جس رستہ پر مَیں چل رہا ہوں شاید اس پر چل کر نہ ہو سکے۔ اِسی طرح خوف کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ یہ بات نہ کی تو خدا تعالیٰ سزا دے گا بلکہ یہ ہوتی ہے کہ شاید مَیں خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب نہ کر سکوں۔

غرض اصل اسلامی تصوف کی بنیاد طمع اور خوف پر ہے اور امید کا پہلو خوف کی نسبت بھاری ہے اور حق یہ ہے کہ اثباتی طاقتیں اُمید سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور خوف سے سلبی طاقتیں پیدا ہوتی ہیں اصل مقصد خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنا ہے اور وہ امید سے پیدا ہوتی ہے خوف سے صرف گناہ دُور ہوتے ہیں۔

دیکھو رسول کریم ﷺ نے کس طرح اپنی امت سے خوف مٹانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اول تو قرآن کریم میں رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ۔ آجانے سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہر ایک چیز سے بڑھ کر ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ نے اس کی اور بھی وضاحت فرما دی۔ حدیث میں آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مُنذر خوابیں شیطانی ہوتی ہیں اور مبشّر خوابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں [۵۴] چونکہ خوابوں کا بہت بڑا اثر انسان کی طبیعت پر پڑتا ہے۔ اس لئے آپ نے یہ فرما دیا کہ مُنذر خوابوں سے خوف نہیں کھانا چاہئے یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مُنذر خوابیں انبیاء کو بھی آتی ہیں پس اس سے مراد یہ نہیں کہ ہر مُنذر خواب شیطانی ہوتی ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اگر کثرت سے مُنذر خوابیں آئیں اور مبشّر خواب آئے ہی نہیں یا کم آئے تو انہیں شیطانی خواب سمجھنا چاہئے۔ اس طرح آپ نے مؤمنوں کے دلوں سے خوف کو دُور کر دیا ہے کیونکہ خوابوں کا اثر انسان کے دل پر خاص ہوتا ہے لیکن چونکہ ہو سکتا ہے کہ ایسے شخص کو جسے شیطانی خوابیں آتی ہوں کوئی سچی خواب بھی آجائے اور وہ اس کو شیطانی سمجھ کر نقصان اٹھائے۔ اس لئے اس کا بھی علاج بتا دیا کہ جب ڈراؤنی خواب آئے تو مؤمن کو چاہئے کہ بائیں طرف تھوک دے اور لَاحَوْلَ پڑھے۔ اِس میں کیا عجیب نکتہ آپ نے فرمایا ہے۔ لوگ کسی چیز کے متعلق کیوں تھوکتے ہیں۔ اس لئے کہ مَیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ رسول کریم ﷺ نے شیطانی خوابوں کے متعلق مؤمن کے نفس کو جرأت دلائی کہ جب اس قسم کی خواب آئے تو تھوک دو کہ ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس طریق سے آپ نے اُمید اور

ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا علاج لَا حَوْلَ پڑھنا فرمایا ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے احتمال ہے کہ ایسی خوابوں میں سے کوئی سچی بھی ہو۔ پس لَا حَوْلَ سے خدا تعالیٰ کے حضور میں استغفار اور اس کی ذات پر توکّل کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ غرض تھوکنے سے شیطانی خواب کے اثر سے محفوظ ہو جائے گا اور لَا حَوْلَ سے خدائی انذار کے اثر سے محفوظ ہو جائے گا کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے۔ وہ اس کی سزا سے بچ جاتا ہے۔ پس جو شخص یہ دونوں علاج کرے گا اس کے دل پر سے خوف دُور ہو جائے گا۔ دیکھو کس لطیف اور عمدہ صورت میں رسول کریم ﷺ نے اپنی اُمت پر سے خوف کے غلبہ کو دُور کیا ہے۔

غزالی اور احمدی فلسفۂ اخلاق میں فرق بتا کر اب میں وہ علاج بتاتا ہوں جو اس روحانی مریض کے مناسب حال ہیں جو عمل سے بالکل رہ گیا ہے اور باوجود کوشش کے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان علاجوں کے بتانے سے پہلے میں اس شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے انسان کے لئے کچھ اور عمل بتانے سے فائدہ کیا ہے کیونکہ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس سے عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی صورتوں میں اور عمل بتانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے۔ (۱) جب تک نیک عمل کرنا انسان کے لئے ناممکن نہ ہو جائے اس وقت تک عمل کے بغیر اس کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر اس کے لئے عمل ناممکن ہو گیا ہو تو پھر بغیر عمل کے بھی پاکیزگی ہو سکتی ہے مگر جب تک عمل کرنا اس کے لئے ممکن ہے اس وقت تک عمل کے بغیر پاکیزگی نہیں ہو سکتی۔ پس اگر عمل ناممکن ہو جائے۔ جیسے کوئی پاگل ہے کہ وہ کوئی عمل نہیں کر سکتا تو اس کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اُسے پھر موقع دیا جائے گا۔[۵۵]

ہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عمل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہر قسم کی حالت کے لوگوں کے لئے ممکن ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ جو دل کی بعض حالتوں میں ناممکن ہوتے ہیں۔ جو عمل بعض قلبی حالتوں میں ناممکن ہو جاتے ہیں وہ جذبات سے اور خیالات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جو عمل کہ ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ناممکن نہیں ہوتے۔ مثلاً نماز ہے اس کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نماز پڑھ سکتا ہی نہیں۔ مگر یہ کہہ سکتا ہے کہ ناجائز محبت میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ پس عمل دو قسم کے ہیں۔ ایک جذبات سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے وہ جن کا تعلق جذبات سے نہیں ہوتا۔

اب دیکھو جسمانی بیماریوں کے علاج کس طرح کئے جاتے ہیں۔ اِسی طرح کہ ایک شخص ڈاکٹر

کے پاس جاتا ہے، وہ بہت کمزور ہوتا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اُسے کہا جاتا ہے۔ ورزش کیا کرو۔ اب کیا وہ یہ کہتا ہے کہ مَیں تو پہلے ہی کام نہیں کر سکتا اور آپ کہتے ہیں ورزش کیا کرو۔ وہ یہ نہیں کہتا کیونکہ اَور کام میں اور ڈاکٹر کے بتائے ہوئے کام میں فرق ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ ڈاکٹر بتاتا ہے گو وہ بھی کام ہے مگر ہے اختیار میں اور دوسرا اس کی طاقت سے بڑھ کر ہے۔ تو طاقت پیدا کرنے کے لئے بھی ایک عمل ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا کمزور جو اُٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چارپائی پر لیٹا رہتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر یہی کہے گا کہ اِسے مالش کیا کرو۔ جب اسے کچھ طاقت آئے گی تو بیٹھ سکے گا پھر اور طاقت آئے گی تو کھڑا ہو سکے گا۔

یہی بات روحانی اعمال میں ہے کہ چھوٹے اعمال پر لگا کر اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ ایک لڑکا جو کہتا ہو کہ مجھ سے دسویں جماعت کی ریڈر نہیں پڑھی جاتی۔ اُسے کہا جائے گا۔ اچھا نویں جماعت کی پڑھا کرو۔ اس کے متعلق وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب مجھ سے دسویں جماعت کی ریڈر نہیں پڑھی جا سکتی تو نویں کی کس طرح پڑھوں گا۔ اِسی طرح روحانیت میں چھوٹے اعمال سے ترقی کر کے بڑے اعمال تک لے جایا جاتا ہے۔

پہلے بیان شدہ علاجوں کے علاوہ ایسے شخص کے لئے بعض اور امور کی بھی ضرورت ہوتی ہے جنہیں میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ پہلے علاج یہ ہیں:۔

(۱) یہ کہ ایسا انسان نیکیوں اور بدیوں کا علم حاصل کرے۔

(۲) ان کے برمحل استعمال کا علم حاصل کرے۔

(۳) محاسبہ نفس کرے۔

(۴) استغفار کثرت سے کرے۔

(۵) خدا تعالیٰ کی معرفت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ پہلے میں نے کہا تھا خدا کی معرفت پیدا کرے۔ مگر یہاں یہ کہتا ہوں کہ معرفت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کی نسبت یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ عمل پر پوری طاقت نہیں رکھتا۔

(۶) نیکی اور بدی کا انجام سوچے۔

(۷) تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کی کوشش کرے۔

اِس سے آگے میں جو علاج بتاؤں گا وہ اصولی ہیں۔ ایسے انسان کے متعلق اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس کے اندر بیماری ہے اور بیماری کا علاج بغیر تشخیص کے نہیں ہو سکتا اس لئے

ضروری ہے کہ وہ علمی طور پر معلوم کرے کہ اُسے کیا بیماری ہے۔ اس کے لئے وہ پہلے اپنے دل سے یہ سوال کرے کہ وہ کس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے؟ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ دل کی پاکیزگی کے لئے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اعمال کی اصلاح کے لئے۔ امر اول خدا تعالیٰ کی محبت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دل کی کمزوری کے یہ معنے ہیں کہ صحیح محبت کا مادہ مفقود ہو گیا ہے۔ مَیں نے کئی دفعہ اپنی ایک رؤیا سنائی ہے کہ مَیں نے دیکھا حضرت مسیحؑ ایک چبوترہ پر کھڑے بچہ کی شکل میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ اوپر سے مَیں نے حضرت مریم کو اُترتے دیکھا۔ وہ کچھ اونچی چبوترہ پر کھڑی ہو گئیں۔ پھر وہاں سے ایک قدم نیچے اُتریں اور حضرت مسیحؑ نے اوپر کی طرف قدم بڑھایا۔ حضرت مسیحؑ ان کی طرف جھکے اور مریم اُن پر جھک گئیں۔ اس وقت میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔ Love Creats Love محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ پس محبت محبت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مگر محبت پیدا کرنے کے لئے بھی سامان ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ (۱) حسن (۲) احسان۔ اب ہم دیکھتے ہیں ایک شخص نے خدا تعالیٰ کا حسن بھی دیکھا یعنی اس کی صفات پر غور کیا۔ اور احسان بھی دیکھے۔ اپنے ساتھ خدا تعالیٰ کے تعلقات پر نظر کی۔ مگر باوجود اس کے اُس کے دل میں محبت نہ پیدا ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی حالت اس بچہ کی سی ہے جو اپنی ماں سے محبت نہیں کرتا اور محبت کا مادہ اُس میں سے مارا گیا ہے۔ جیسے اگر کسی انسان کے پیٹ میں نہ غذا جاتی ہے اور نہ دوا۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا معدہ خراب ہو گیا ہے۔ اس کے لئے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس کے معدہ کو قوت دیں اور روحانیت میں یہ علاج ہے کہ اس کے احساسات اُبھاریں۔ سو ایسے انسان کے لئے پہلا علاج یہ ہے کہ چونکہ ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے وہ ظاہری طور پر خشوع و خضوع اختیار کرے۔ نماز پڑھے تو رونے کی صورت بنائے خواہ تصنع سے ہی بنانی پڑے۔ بعض کام اگر تصنع اور بناوٹ سے بھی کئے جائیں تو اُن کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ مَیں نے امریکہ کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ ایک پروفیسر طالب علمی کی حالت میں بہت قابل تھا آخر اُسے ایک کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ مگر اس وقت وہ سخت ناقابل ثابت ہوا۔ اس نے اس کی وجہ ایک علم النفس کے ماہر سے پوچھی تو اس نے بتایا کہ تمہارے دل میں اتنی زیادہ نرمی ہے کہ اس کی وجہ سے تم انتظام قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کا اس نے علاج پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم اپنے دانت اور جبڑے جوڑ کر رکھا کرو۔ یعنی منہ کو سختی سے بند کیا کرو جس سے غصہ کی حالت نظر سے اُس نے ایسا ہی کیا اور کچھ عرصہ کے بعد اُس میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا کہ ملک میں مشہور ہو گیا کہ سب سے زیادہ سخت

پرنسپل وہی ہے اور اس نے خوب انتظام کر لیا۔

تو ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو بزدل ہو وہ اگر اکڑ کر چلے تو اس میں جرأت اور دلیری پیدا ہو جائے گی۔ فوج کے سپاہیوں سے ایسا ہی کرایا جاتا ہے۔ ان کو مشق کرائی جاتی ہے کہ اونچی گردن رکھ کر اور چھاتی تان کر چلیں۔ اس سے ان میں بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ پس پہلا علاج یہ ہے کہ کسی شخص میں جو عیب ہو اس کے مقابل کی صفت تصنع سے اختیار کرے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں فی الحقیقت وہ صفت پیدا ہو جائے گی۔ محبت کا مادہ پیدا کرنے کے لئے انسان ظاہری محبت کے آثار ظاہر کرے۔ مثلاً کسی سے مصافحہ کرے تو خوب بھینچ کر اور تپاک سے کرے۔ ایک شخص اس کے پاس آکر بیٹھے۔ جب وہ اٹھنے لگے تو خواہ دل میں یہی چاہتا ہو کہ چلا جائے مگر اصرار کرے کہ اور بیٹھو۔ اس طرح جب وہ ظاہر میں محبت کے آثار ظاہر کرے گا تو آہستہ آہستہ اس میں حقیقی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور پھر وہ خدا تعالیٰ سے بھی محبت کرنے لگ جائے گا کیونکہ پہلے اس کے محبت نہ کرنے کی یہی وجہ تھی کہ اس میں محبت کا جذبہ ہی نہ تھا۔

(۲) اس کے علاوہ دوسرا علاج یہ ہے کہ ماں باپ، بیوی بچوں سے پیار میں زیادتی کرے یہی وہ نکتہ ہے جسے عشق مجازی کہا جاتا ہے۔ صوفیاء نے اسی کو عشق مجازی قرار دیا تھا کہ جن سے محبت کرنا جائز ہے اُن سے محبت میں زیادتی کی جائے مگر بعد میں اس کو بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنا لیا گیا۔ عشق مجازی کے یہی معنی نہیں ہیں کہ ایک شخص کوئی خوبصورت لڑکا تلاش کرے۔ اس سے محبت کرنے لگ جائے یا اور اسی قسم کی ناجائز محبت میں گرفتار ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے محبت کرنا جائز ہے اُن سے زیادہ محبت کرے۔ اس طرح اس میں محبت کا جذبہ زیادہ پیدا ہو گا اور پھر خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا جذبہ بڑھے گا۔

دوسری چیز جس کے لئے اپنی روحانیت کی اصلاح کی غرض سے انسان کوشش کرتا ہے وہ اعمال کی اصلاح ہے۔ اس کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ ہر ایک عمل قوت ارادی سے ہوتا ہے۔ انسان ارادہ کرتا ہے کہ یوں کرنا ہے اور پھر کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص کہتا تو رہتا ہے کہ میں نے فلاں کام کرنا ہے مگر کر نہیں سکتا تو اُس کی اس بے بسی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں یا تو (۱) اس کا قبضہ ارادہ پر نہیں رہا۔ انسان میں جو "میں" ہے وہ کمزور ہو گئی ہے اس وجہ سے وہ ارادہ پر حکومت نہیں کر سکتا "میں" بطور مالک کے ہوتی ہے اور ارادہ بطور داروغہ کے۔ مالک کمزور ہو گیا ہے اور وہ داروغہ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام کر آؤ بلکہ اس سے ڈرتا ہے۔ اس وجہ سے داروغہ

کام کرانے میں سست ہو جاتا ہے (۲) یا پھر یہ کہ "مَیں" تو مضبوط ہے مگر داروغہ بیمار ہو گیا یعنی قوت ارادی کمزور ہو گئی ہے اور اس کا جذبات پر قابو نہیں رہا۔ جذبات داروغہ یعنی قوت ارادی کے ماتحت بطور ملازم ہوتے ہیں۔ جب داروغہ بیمار ہو گیا تو ملازم سُست ہو گئے۔ اس کا حکم نہیں مانتے۔ گویا اس طرح "مَیں" اور احساسات میں جو واسطہ تھا وہ کمزور ہو گیا۔

(۳) اگر یہ بھی نہیں تو یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسی چیز ارادہ اور احساسات کے درمیان آ گئی ہے کہ باوجود اس کے کہ ارادہ حکم دینے کی طاقت تو رکھتا ہے اور احساسات ماننے کے لئے بھی تیار ہیں مگر ان میں اتنا فاصلہ ہو گیا ہے یا روک پیدا ہو گئی ہے کہ احساسات تک حکم نہیں پہنچتا۔

پس عملی گناہ یا نیکی میں کمی کے یہ تین سبب ہوتے ہیں یعنی (۱) انانیت کی کمزوری (۲) ارادہ کی کمزوری (۳) بعض اور چیزوں کی دخل اندازی احساسات کو ارادہ کے قبضہ سے نکال لیتی ہے جیسے مثلاً عادت ہے، ایک شخص کو حقہ پینے کی عادت ہے وہ ارادہ رکھتا ہے کہ حقہ نہیں پینا۔ مگر جب سامنے حقہ دیکھتا ہے تو کچھ نہیں کر سکتا اور عادت سے مجبور ہو کر پی لیتا ہے۔

اب مَیں وہ امور بتاتا ہوں جن سے انانیت بڑھتی ہے اور انسان کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے (۱) پہلی چیز جو مَیں کو مضبوط کرتی ہے وہ قوت بقاء یعنی قائم رہنے کی خواہش ہے۔ ہر چیز میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ مجھے باقی رہنا چاہئے۔ ایک معمولی سے کیڑے کو مارو تو وہ تلملاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ انسان جس میں مذکورہ بیماریاں پیدا ہو جائیں اسے خیال کرنا چاہئے کہ اگر میری یہی حالت رہی تو مَیں مرا مگر مجھے تو زندہ رہنا ہے اس لئے قوت بقاء کو مضبوط کرے۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے اور فکر سے جلدی بڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ یہی دیکھ لو ایک حقہ پینے والا حقہ دیکھ کر اس کے پاس جا بیٹھے گا۔ شراب پینے والا شراب دیکھ کر اُس کی طرف دوڑے گا۔ لیکن اگر کوئی تلوار لے کر اُسے وہاں مارنے کے لئے آئے تو پھر دیکھو کس طرح بھاگتا ہے۔ کہتے ہیں شرابی کو اگر جوتیاں ماری جائیں تو اس کا نشہ دُور ہو جاتا ہے۔ یہ بقاء کی خواہش کا ہی غلبہ ہوتا ہے جس کے باعث نشہ دُور ہو جاتا ہے۔

(۲) اِفناء کی خواہش کو مضبوط کرے۔ یہ تقاضا پہلے تقاضا کا لازمی نتیجہ ہے۔ ابقاء کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی جب تک اِفناء کی خواہش کو مضبوط نہ کرے۔ اُسے چاہئے کہ اِفناء کی خواہش کو بھی مضبوط کرے یعنی سوچے کہ جو چیز میرے مقاصد میں حائل ہو گی مَیں اس کو پیس ڈالوں گا۔

(۳) تیسرا ذریعہ انانیت کے بڑھانے کا جذب کی طاقت کو مضبوط کرنا ہے۔ ایسا انسان سوچے کہ جن چیزوں کی مجھے ضرورت ہے وہ مَیں ضرور لوں گا۔ جن جن چیزوں کا حاصل ہونا مشکل نظر آئے ان کے متعلق یہ احساس دل میں بار بار قائم کرے اس سے انانیت غالب آجائے گی۔

(۴) قوت مقابلہ کی طاقت کو مضبوط کرے۔ یعنی یہ خیال کرے کہ جو چیزیں مضر ہوں گی ان کا مَیں مقابلہ کروں گا۔

(۵) استقلال کی طاقت کو مضبوط کرے۔ اس سے بھی مَیں پیدا ہوتی ہے۔ استقلال کبھی کبھی مشکل ہوتا ہے اور بعض کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ مگر بعض لوگ اس کے متعلق بے توجہی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ خیر اس بات کو جانے دو یہ عادت نہ رہنی چاہئے۔ کیونکہ اگر انسان بعض باتوں میں استقلال دکھائے تو دوسری باتوں میں استقلال کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اس طرح مَیں کی طاقت مضبوط ہو جاتی ہے۔

(۶) مصلحت۔ یہ بھی بقاء کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مصلحتِ وقت کو غور کر کے کام کرے اِس سے تدبیر حکمت، راز رکھنے اور نفس پر قابو رکھنے کی قابلیت پیدا ہوگی اور انانیت ترقی کرے گی۔

(۷) احتیاط۔ ہوشیاری، چوکس رہنا، دُور اندیشی۔ ان باتوں کو ذہنی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ ان سے بھی انانیت ترقی کرے گی۔

(۸) اپنی مدح سے نفرت کرے۔ اگر کوئی کرے تو اُسے روک دے۔ اس سے بھی انانیت مضبوط ہوتی ہے۔ مدح انانیت کو مار دیتی ہے اور نہایت تیز چُھری ہے جو اُسے ذبح کر دیتی ہے۔ دیکھو قرآن کریم میں کیا لطیف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا۔ [۵۶] کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے ان کے متعلق ان کی تعریف کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ وہ بات مانتے ہیں جو لوگ ان کے متعلق کہیں اور خود اپنے نفس پر غور نہیں کرتے کہ انہوں نے کوئی کام کیا بھی ہے کہ نہیں یعنی ایسے لوگ خود کام نہیں کرتے جو تھوڑا بہت کام ہو جائے اُسی پر خوش ہو جاتے ہیں اور جو دوسرے بتائیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے اسے مان لیتے ہیں کہ ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ گویا دوسروں کی مدح ان کے لئے جو خیالی محل بنا دیتی ہے اس میں ایسے لوگ رہتے ہیں۔ پس مدح سے نفرت کرنے سے انانیت مضبوط ہوتی ہے۔

(۹) نواں علاج عزتِ نفس کی طاقت کا پیدا کرنا ہے۔ یعنی انسان ہر قسم کی ذلت اور شرمندگی کی برداشت سے انکار کرے۔ کہے میری طرف بدی کیوں منسوب ہو۔ اس طرح نفس کو غیرت آتی ہے۔ اور وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر ارادہ سے کام کرا لیتا ہے۔

(۱۰) دسواں علاج وقار ہے یعنی جو باتیں تم سے متعلق نہ ہوں ان میں خواہ مخواہ دخل نہ دو۔ ہر کام میں دخل دینا چھچھورا پن ہوتا ہے اور اس سے انانیت مُردہ ہو جاتی ہے۔

(۱۱) گیارھواں علاج امید ہے۔ اس طاقت کو اپنے اندر بڑھاؤ۔ اس سے بھی اعزازِ نفس حاصل ہوتا ہے۔ انسان یقین رکھے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اس طرح اپنے نفس پر اعتبار کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱۲) بارھواں علاج خوش مزاجی ہے۔ اس سے انسان میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور کُڑھنے سے طاقت ضائع ہو جاتی ہے۔

اِن میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مشکل ہیں لیکن اگر کوئی ان میں سے چند پر بھی عمل کرے گا تو اس میں طاقت پیدا ہونی شروع ہو جائے گی۔ یہ سب امور ذہنی ہیں اور ان کی مشق سے انسان کی ذہنی قوتیں نشوونما پا سکتی ہیں یہاں تک کہ ارادہ ہی ماتحت آجائے۔ ان کے استعمال کا بہتر طریق یہ ہے کہ انسان انسان کی حیثیت پر غور کرے جو مَیں نے بتائی ہے اور اس سے چند ہی دن میں علیٰ قدرِ مراتب وہ اپنے اندر انانیت کا جذبہ بڑھتا ہوا پائے گا۔

مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انانیت ہی حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس سے گناہ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جیسے ایک ظالم آقا ہو جو خواہ مخواہ نوکروں کو مارتا رہتا ہو۔ ایسی حالت میں اس کا علاج خدا تعالیٰ کی بے نیازی پر غور کرنا ہے۔ انسان سوچے کہ اگر میری مَیں اس طرح ہر نقص پر گرفت کر رہی ہے تو اگر خدا تعالیٰ مجھ سے یہی سلوک کرے تو میری کیا حالت ہو اور یہ سوچے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ مَیں اس کا مالک نہیں ہوں۔ مَیں تو صرف امین ہوں اور امانت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اس لئے مجھے بے جا سختی نہیں کرنی چاہئے۔

جب انانیت پیدا ہو جائے یا وہ پہلے ہی موجود ہو مگر مشکل ارادے کے متعلق ہو یا درمیانی روکوں کے متعلق ہو تو اس صورت میں اس کا مندرجہ ذیل علاج ہے۔

(۱) اول تو وہی ظاہر و باطن کی مشابہت پیدا کرنا ہے جو پہلے بیان کر آیا ہوں کہ ظاہری طور پر انسان تصنع سے ہی کام کرے اس کا اثر باطن پر پڑے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس پر

خاص زور دیا ہے۔

(۲) دوسرا علاج کامل توجہ ہے۔ یہ گُر کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خیالات کو ایک ہی رَو میں چلائے اور اپنے دل سے خدا تعالیٰ کے سوا باقی سب چیزوں کے خیالات مٹا دے۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا[۵۷] جو لوگ کسی کام میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں اُس میں غرق ہو جاتے ہیں گویا وہ اپنے خیالات کو اس طرح چلاتے ہیں کہ صرف وہی کام اُن کا مقصد رہ جاتا ہے اور کسی چیز کی خبر انہیں نہیں ہوتی۔ جب کسی کام کے متعلق نفس میں پورا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے تب اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے وہ یہ خیال کرے کہ مجھے جھوٹ چھوڑ دینا چاہئے تو اس سے کامیابی نہ ہو گی جب تک رات دن اس کی توجہ اسی طرف نہ ہو گی کہ جھوٹ نہیں بولنا اور جھوٹ چھوڑ دینا ہے۔

ایک بات کا بار بار خیال کرنے سے یہ طاقت پیدا ہوتی ہے مگر اس طاقت کے متعلق خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پاگل ہو جاتی ہے۔ یعنی ارادہ کے قبضہ سے نکل جاتی ہے اور اِدھر اُدھر ناچنے لگتی ہے۔ ہمارے ملک میں کئی لوگ پوچھا کرتے ہیں۔ نماز میں دلیلیں آتی ہیں ان کے دُور ہونے کا کوئی علاج بتایئے۔ دلیلیں آنے کا یہی مطلب ہے کہ ایسے شخص کی خیال کی طاقت پاگل ہو گئی ہے اسے توجہ تو پیدا ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ اور چیزوں کی طرف۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف لگاتا ہے وہ کہیں اور بھاگ جاتی ہے۔ پس جن لوگوں کو نماز میں دلیلیں آتی ہوں ان کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ انہیں توجہ نہیں پیدا ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اُن کی توجہ قوتِ ارادی کے قبضہ میں نہیں ہوتی خود مختار ہو جاتی ہے اور جدھر چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں اس کو قوتِ ارادی کے ماتحت رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ نماز میں جو شخص اَور خیالات میں پڑ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے اس کی توجہ ارادہ کی قوت کے قبضہ سے نکل گئی ہے۔ اس صورت میں سب سے پہلا کام اُسے قوت ارادی کے ماتحت لانا ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ اُسے کس طرح ماتحت لائیں؟ اس کا اصل جواب تو مَیں آگے چل کر دونگا لیکن ایک اور نسخہ بتاتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ایسے لوگ نماز میں اس امر کا خیال کرنا چھوڑ دیں کہ زور سے توجہ قائم کریں تو پھر ان کی یہ حالت نہ ہو گی۔ معمولی باتوں کی طرح نماز بھی پڑھیں۔

(۳) تیسری چیز قوت ارادی کا استعمال ہے۔ ارادہ کرے کہ مَیں اس کام کو کرتا ہی جاؤنگا اور

کسی روک کی پرواہ نہیں کرونگا۔ بعض دفعہ چونکہ قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اس لئے ایک کام کا انسان ارادہ کرتا ہے مگر پھر گر جاتا ہے۔ اس لئے مَیں قوت ارادی کو مضبوط اور طاقتور بنانے کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہوں جس میں تیرہ دوائیں پڑتی ہیں اور وہ دوائیں قرآن کریم اور احادیث سے ملتی ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اس آیت کو انسان ورد میں لائے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَیں نے انسان کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یعنی اپنا بندہ بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس بات کا خیال کرے اور کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے اور خدا تعالیٰ کی پیدائش رائیگاں نہیں جاسکتی۔ مَیں ضرور اس کا عبد بنوں گا اور ہو نہیں سکتا کہ نہ بنوں۔ وہ یہ خیال نہ کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مَیں کچھ نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس طرح نقشہ جمائے اور اس طرح تصور باندھے کہ گویا خدا تعالیٰ نے اسے پکڑ کر کہا ہے کہ اُٹھ کام کر۔ یہ وہی بات ہے جسے صوفیاء مراقبہ کہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان گردن ڈال کر بیٹھا رہے بلکہ یہ ہے کہ بار بار سوچے اور غور کرے کہ بھلا کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے عبد بننے کے لئے پیدا کرے اور مَیں کچھ اور بن جاؤں۔

(۲) اس آیت کے مضمون پر غور کرے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [۵۸] خدا تعالیٰ نے مجھے بہترین طاقتیں دے کر بھیجا ہے جو نیکی بھی کسی انسان کے لئے ممکن ہے وہ میرے لئے بھی ممکن ہے اور جو بھی اعلیٰ درجہ حاصل ہونا ممکن ہے وہ میرے لئے بھی ممکن ہے پھر میں کس طرح گر سکتا ہوں۔ اس بات کا بھی خوب نقشہ جمائے اور بار بار اس پر غور کرے۔

(۳) تیسرے اس آیت کا ورد کرے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ [۵۹] اور اس رنگ میں اس کا مفہوم سوچے اور اسے ذہن میں نقش کرے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہ ان باریک در باریک وساوس کو جانتا ہے جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دل کو پراگندہ کر سکتے ہیں حتیٰ کہ وہ انسان کے نفس سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔ نفس جب وسوسے پیدا کرتا ہے وہ جھٹ اس کو مٹا سکتا ہے۔ یہی بات خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کی ہے اور بندہ کو تسلی دی ہے کہ خوف کی کیا وجہ ہے جبکہ وسوسوں کے سامان سے زیادہ قریب وسوسے مٹانے کے سامان ہیں۔

(۴) اس آیت پر غور کرے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ [۶۰] اس کے متعلق اس طرح سوچے کہ میں مؤمن ہوں اور مؤمن کسی سے مغلوب

نہیں ہو سکتا۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ میری قوت ارادی غالب نہ آئے۔ اسے اس قدر دُہرائے کہ قوتِ ارادی نفس پر غالب آجائے۔

(۵) یہ آیت پڑھا کرے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ [۶۱] یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں پر شیطان کا قبضہ نہیں ہے۔ وہ سوچے میں خدا تعالیٰ کا بندہ ہوں اور خدا کے بندوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہو سکتا۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ بدی مجھ پر غالب آجائے۔

(۶) یہ آیت پڑھے لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ [۶۲] اور یہ خیال کرے کہ میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں مؤمن ہوں اور مؤمن کو سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں ہو سکتا۔

(۷) اس آیت پر غور کرے نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ [۶۳] جو مؤمن ہوتا ہے اس پر فرشتے نازل ہوتے اور کہتے ہیں ہم تمہارے مددگار ہیں پھر تم کیوں گھبراتے ہو۔

(۸) آیت وَ لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ [۶۴] پڑھے اور سوچے۔ میں مشکلات سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ مایوسی موت ہے جسے قبول کرنے کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔ اگر ارادہ نہیں مانتا تو میں اسے سیدھا کر کے چھوڑوں گا۔

(۹) یہ آیت زیر غور رکھے یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ [۶۵] میں مطمئن ہوں اور غیر محدود امیدیں میرے سامنے کھڑی ہیں۔ پھر مجھے کیا گھبراہٹ ہو سکتی ہے جبکہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور فرماتا ہے۔ جا اس جنت میں داخل ہو جا جو کبھی برباد نہیں ہو سکتی۔

(۱۰) حدیث یُوْضَعُ لَہُ الْقَبُوْلُ [۶۶] زیر نظر رہنی چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ مؤمن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ اس کی قبولیت دنیا میں پھیلائی جائے گی اور وہ ذلیل نہیں ہو گا۔ اِس سے بھی قوت ارادی بڑھتی ہے۔

(۱۱) وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ [۶۷] کی آیت پر غور کرتا ہوا یہ خیال کرے کہ سب ناکامیاں لالچ اور حرص سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر مجھے کسی چیز کی حرص نہیں ہے۔ کیا پہلے ہی خدا تعالیٰ نے میرے لئے سب کچھ نہیں بنا چھوڑا؟

(۱۲) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [۶۸] اس میں یہ سوچے کہ بدخیال، بد ارادے اور بد تحریکیں میرے دل میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتیں کیونکہ مَیں اس امت میں سے ہوں جس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کہ وہ کافروں کا اثر قبول نہیں کرتے بلکہ مؤمنوں کا اثر قبول کرتے ہیں۔

(۱۳) كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ [۶۹] کا ورد کرے اور اس حدیث کو سوچے لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ [۷۰] وہ یہ خیال کرے کہ جو نیک ارادے میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ دوسروں پر اثر کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے نیکوں کے پاس جاؤ۔ اگر میرا کسی پر اثر نہیں ہوتا تو پھر میں مؤمن نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) اس بات پر غور کرے کہ خدا تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے متعلق فرمایا ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ [۷۱] ہم نے نہ تجھے اور نہ کسی اَور انسان کو ہمیشہ اس دنیا میں رہنے کے لئے بنایا ہے۔ انسان خیال کرے کہ جب مجھے ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہنا تو مجھے اپنے وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

اِن چودہ باتوں میں سے قوت ارادی کو وہ طاقت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ جذبات اور احساسات کو دبا لیتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان ان باتوں پر پورے طور پر غور و فکر کرے۔

(۴) چوتھا علاج ارادے کو مضبوط کرنے یا اس کے راستہ سے روکیں دُور کرنے کا یہ ہے کہ جس عیب کو دُور کرنا ہو اس پر شروع دن سے ہی یکدم حملہ کر دے۔ جب فوج کسی مقام پر حملہ کرتی ہے تو پہلے حملہ میں سارا زور صرف کر دیتی ہے اسی طرح کسی بدی کے دور کرنے کے متعلق کرنا چاہئے۔ یعنی جس بدی کو دُور کرنا مدنظر ہو اس پر پورا زور صرف کرنا چاہئے۔

(۵) پانچواں علاج یہ ہے کہ جو نیک خصلت پیدا کرنی ہو اس کی عادت ڈالے یا جس خصلت کو چھوڑنا چاہے اُس کے اُلٹ عادت ڈالے۔ مثلاً اگر غصہ پیدا ہو تو نرمی کی عادت ڈالے۔

(۶) فکر اور تَأَنِّیْ کی عادت ڈالے۔ جلد بازی سے بچے۔ اس سے جو عادات پہلے پڑ چکی ہوں گی ان کے حملہ سے محفوظ ہو جائے گا۔ کیونکہ عادات جلد بازی سے فائدہ اٹھا کر ہی حملہ کرتی ہیں اور سوچ کے اور غور کر کے کام کرنے پر وہ حملہ نہیں کر سکتیں۔

(۷) جس بات کے کرنے یا چھوڑنے کا ارادہ کرے اس کی پوری حقیقت کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرے اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک مکمل نقشہ

اس کے ذہن میں قائم ہو جائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ جو کام کرنے کا ہو گا اُسے یہ آسانی سے کر سکے گا اور جو چھوڑنے کا ہو گا اُسے آسانی سے چھوڑ سکے گا۔

(۸) جو باتیں جائز ہوں اور اُن کی طرف اُسے رغبت ہو۔ انہیں بعض موقعوں پر ترک کر دے تا کہ مرضی کے خلاف کام کرنے کی اُسے عادت پڑے۔ مثلاً ایک شخص کو چوری کی عادت ہو گئی ہے اور دُور نہیں ہوتی تو اُسے چاہئے کہ بعض جائز باتیں جن کی طرف اُسے رغبت ہے انہیں چھوڑنا شروع کر دے۔ مثلاً ایک وقت دل سونے کو چاہتا ہے اور نہ سوئے۔ ایک چیز کے کھانے کو چاہتا ہو اور یہ نہ کھائے۔ اِس طرح دل کو طاقت حاصل ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے مَیں اس کا یہی مطلب سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ [۲] کہ مَیں نے خدا تعالیٰ کو پختہ ارادوں کے بار بار ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مَیں نے بعض ارادے کئے جو ٹوٹے۔ میں نے پھر کئے پھر ٹوٹے لیکن جب مَیں نے بار بار ارادوں کے ٹوٹنے کے باوجود ان کا کرنا نہ چھوڑا اور ہمت نہ ہاری تو مجھے خدا تعالیٰ مل گیا۔ پہلے ہی اگر مَیں ارادہ کے ٹوٹ جانے پر ناامید ہو کر بیٹھ رہتا اور پھر عزم نہ کرتا تو مَیں خدا تعالیٰ کے پانے میں ناکام رہتا۔

(۹) انسان اپنے نفس کا بار بار مطالعہ کرے۔ جس طرح ایک حکیم مریض کو بار بار دیکھتا ہے اِسی طرح وہ اپنے نفس کو دیکھے۔

(۱۰) مقصد بلند رکھے۔ درمیانی حالت پر قانع نہ ہو جائے۔ جو چیز لینا چاہتا ہے اس کی انتہائی حد مدنظر رکھے۔ جو شخص انتہائی درجہ کا ارادہ رکھتا ہے اُسے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ اس طرح انسان اپنے نفس پر قابو پا جاتا ہے۔

اس کوشش کے علاوہ ایک اَور گُر ہے اور وہ دُعا کا گُر ہے جب انسان سے اپنی کوششوں کے ذریعہ کچھ نہ بنے تو اُسے بیرونی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی چیز اپنی کوشش ہوتی ہے جو اندرونی امداد ہوتی ہے اور دوسری بیرونی امداد ہوتی ہے۔ انسان اپنی طرف سے کوشش کرے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ سے دُعا کرے کہ مجھ سے تو جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔ اب آپ ہی مدد دیں تو کامیاب ہو سکتا ہوں۔ ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے۔ ان کا ایک شاگرد تھا جسے تصوّف کا بہت شوق تھا وہ اس کے سیکھنے کے لئے بہت عرصہ ان کے پاس رہا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو ان بزرگ نے پوچھا۔ کیا تمہارے وطن میں شیطان ہوتا ہے؟ وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔ شیطان کہاں نہیں ہوتا۔ بزرگ

نے کہا جب تم اپنے وطن پہنچو گے تو اگر شیطان نے تم پر حملہ کیا تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا۔ مَیں شیطان کا مقابلہ کروں گا۔ بزرگ نے کہا۔ اچھا تم نے شیطان کا مقابلہ کیا اور وہ بھاگ گیا۔ لیکن پھر تم خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے لگے اور اُس نے پیچھے سے آ پکڑا تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا۔ مَیں پھر اس کا مقابلہ کروں گا۔ بزرگ نے کہا اگر تم اسی طرح شیطان کا مقابلہ کرتے رہو گے تو خدا تعالیٰ کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکو گے؟ اس نے کہا تو پھر آپ ہی بتائیں مجھے کیا کرنا چاہئے؟ انہوں نے کہا۔ بتاؤ اگر تم کسی دوست کو ملنے جاؤ جس کا ایک کُتّا ہو جو تمہیں گھیر لے تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا مَیں اُسے لاٹھی مارونگا۔ انہوں نے کہا۔ کُتّا بھاگ کر پھر تمہارے پیچھے آ پڑا تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا صاحب مکان کو آواز دوں گا کہ آؤ اور آ کر اپنے کُتّے کو روکو۔ انہوں نے کہا۔ یہی طریق شیطان کے متعلق اختیار کرنا۔ خدا تعالیٰ سے کہنا مَیں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں مگر شیطان مجھے آنے نہیں دیتا۔ آپ ہی اس کو دُور کریں۔ پس برائیوں سے بچنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ انسان دُعا کرے کہ الٰہی! میں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں آگے مدد آپ نے دینی ہے۔

دسویں بات مَیں نے یہ بیان کی تھی کہ انسان اپنا مقصد بلند رکھے۔ ایک دوست نے اس کے متعلق سوال کیا ہے کہ کیا بلند خواہشات بھی جائز ہیں؟ میرے نزدیک یہ جائز نہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی لکھا ہے کہ الہام کی خواہش نہیں کرنی چاہئے۔[۳] مگر مقاصد کے بلند ہونے اور کسی بات کی طمع اور حرص میں بڑا فرق ہے۔ حرص کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جو چیز اچھی دیکھے اسی کے متعلق خواہش کرے کہ مل جائے۔ لیکن مقصد وہ ہوتا ہے جو پہلے مقرر کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ گویا حریص تو سوالی بنتا ہے لیکن مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنے والا علوِ ہمت والا بنتا ہے۔

اسی طرح الہام کی خواہش کا حال ہے۔ الہام دعوت ہے جو خدا تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دیتا ہے اب اگر کوئی کہے میں فلاں دوست سے اس لئے ملنے جاتا ہوں کہ اس کے ہاں مکلّف دعوت کھاؤں تو یہ کیسی کمینہ بات ہوگی اور سب لوگ اُسے بُرا سمجھیں گے۔ لیکن اگر کوئی کہے مَیں فلاں دوست سے ملاقات کرنے کے لئے جاتا ہوں تو خواہ اُسے کتنی مکلف دعوت ملے اُسے کوئی بُرا نہ کہے گا۔ اسی طرح الہام کی خواہش کا حال ہے۔ جب کوئی دُعا کرے گا کہ خدا تعالیٰ مجھے اعلیٰ مقام پر پہنچا دے اور اپنا قُرب عطا فرمائے تو اس مقام کے حاصل ہوتے ہی اُسے الہام کی دعوت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ مجھے الہام ہو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اس

دعوت کے حصول کا خواہشمند ہے خدا تعالیٰ کے قُرب کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے الہام کی خواہش کرنا درست نہیں ہے۔

اَب مَیں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ یہ اصول جو مَیں نے بیان کئے ہیں اگر ان پر عمل کرنے کے باوجود نیک اعمال میں ترقی نہ ہو اور بُرائیوں سے انسان بچ نہ سکے تو سمجھنا چاہئے کہ اسے روحانی بیماری نہیں بلکہ جسمانی بیماری ہے۔ اس کے اعصاب میں نقص ہے۔ ایسی حالت میں اسے ڈاکٹروں سے مشورہ لینا چاہئے اور اگر یہ بات میسّر نہ ہو۔ تو یہ چار باتیں کرے۔ (۱) ورزش کرے (۲) دماغی کام چھوڑ دے (۳) عمدہ غذا کھائے (۴) اپنا دل خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بسا اوقات امراض روحانی وہم سے بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے وہم سے جسمانی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں ایسے ہی وہم سے روحانی بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں۔ میرا اپنا ہی تجربہ ہے۔ جب میں طب پڑھنے لگا تو جو بیماری پڑھتا تھا اس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ یہ تو مجھ میں بھی ہے۔ مَیں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید یہ میرا ہی حال ہو گا۔ لیکن ایک ڈاکٹری کے طالبعلم نے مجھے بتایا کہ اُن کے استاد نے جماعت کو نصیحت کی تھی کہ طلباء کو اس قسم کا وہم ہوا کرتا ہے انہیں اس میں مبتلاء نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے مَیں آپ لوگوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو روحانی بیماریوں کا خیال کر کے یہ سمجھنے لگ جاؤ کہ یہ ہم میں بھی ہیں اور اس طرح خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان بیماریوں میں مبتلاء کر لو۔ سنا ہے ایک اُستاد تھا جو لڑکوں پر بڑا ظلم کرتا تھا۔ ایک دن لڑکوں نے ارادہ کیا کسی طرح چھٹی لینی چاہئے۔ ایک لڑکے نے کہا اگر میرا ساتھ دو تو مَیں چھٹی لے دیتا ہوں۔ مَیں جا کر کہوں گا اُستاد جی آپ کو آج کیا ہوا ہے آپ کا چہرہ زرد معلوم ہوتا ہے پھر تم آنا اور میری تائید کرنا۔ لڑکوں نے یہ تجویز مان لی۔ اس پر اُس لڑکے نے جا کر کہا۔ اُستاد جی خیریت ہے؟ اُستاد نے کہا۔ کیا بکتا ہے اپنا کام کرو۔ اُس نے کہا آپ کا چہرہ زرد معلوم ہوتا ہے۔ اس پر اُستاد نے اسے گالیاں دیں۔ اور دوسرا ایک اور آگیا۔ اُس نے آکر بھی یہی کہا۔ اُسے بھی گالیاں دیں مگر پہلے کی نسبت کم۔ آخر لڑکوں نے باری باری آنا اور یہی کہنا شروع کیا۔ چھٹے ساتویں لڑکے تک اُستاد جی نے اِتنا مان لیا کہ ذرا طبیعت خراب ہے تم تو یونہی پیچھے پڑ گئے ہو۔ جب پندرہ سولہ لڑکوں نے کہا تو اُستاد جی کہنے لگے۔ کچھ حرارت سی محسوس ہوتی ہے۔ اچھا لیٹ جاتا ہوں۔ یہ خیال کرتے کرتے اس کو بخار ہو گیا اور لڑکوں کو چھٹی دے کر گھر چلا گیا۔ لڑکوں نے گھر جا کر اپنی ماؤں سے کہا کہ اُستاد جی بیمار ہو گئے ہیں ان کی عیادت کرنی چاہئے۔ جب عورتیں ان کے گھر جانے لگیں اور اظہار

ہمدردی کرنے لگیں تو اُس نے سمجھائیں تو بہت سخت بیمار ہوں آخر اُسی بیماری میں وہ مر گیا۔

یہ تو ایک لطیفہ ہے مگر یورپ میں تحقیقات کی گئی ہے کہ جب سے پیٹنٹ ادویات نکلی ہیں امراض بڑھ گئی ہیں۔ ان دواؤں کے اشتہار میں مشتہرین اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ ساری مرضیں لکھ کر لکھ دیتے ہیں کہ یہ دوا ان سب بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ پڑھنے والے کسی نہ کسی مرض میں اپنے آپ کو مبتلاء سمجھ کر منگوا لیتے ہیں اور پھر ان کا وہم ترقی کرتا کرتا فی الحقیقت انہیں بیمار بنا دیتا ہے۔ پس وہم میں بھی نہیں پڑنا چاہئے۔

دوسری بات یہ سمجھ لو جو قومی طور پر بھی ضروری ہے کہ اشاعت فاحشہ نہ ہو۔ کئی لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کو بدنام کرنے کے لئے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں کے سب لوگ بدمعاش اور دوسروں کا حق مارنے والے ہیں۔ پہلے تو کچھ لوگ اس کے خلاف آواز اٹھانے والے بھی ہوتے ہیں مگر پھر وہ بھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اگر ایسے لوگ ہیں تو اپنے گھر میں ہمیں ان سے کیا۔ پھر اس سے آگے بڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں ایسے لوگ ہیں تو سہی مگر ہم کیا کریں۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ وہ بھی کہنے لگ جاتے ہیں کہ سب لوگ بدمعاملہ اور بدمعاش ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہئے۔ ورنہ خود بھی انسان اس برائی میں مبتلاء ہو جاتا ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ جو شخص کسی پر الزام لگاتا ہے وہ خود ایسا ہی ہو جاتا ہے۔[۴] اس طرح قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اس لئے جو شخص فواحش کی اشاعت کرے اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور اس سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ جو بُرا ہے اس کا نام لو عام بات کیوں کہتے ہو کہ سب لوگ ایسے ہو گئے ہیں جو بُرا ہے اس کا نام بتاؤ اور جس بُرائی میں وہ مبتلاء ہے وہ بھی بتاؤ۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں جو قوم کے متعلق کہتا ہے کہ بد ہو گئی۔ وہی شخص ان کو بدکار بنا دے گا۔[۵] یعنی لوگوں کو کہنا کہ ہماری قوم بُری ہو گئی یہ خیال قوم کو ویسا ہی بنا دے گا۔ تو ہمیشہ ایسے قومی دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے جو فحش کی اشاعت کرتا اور قوم کو بُرا کہتا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جو قوم نڈر ہو جاتی ہے وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے اصل علاج یہ ہے کہ ایسے ہر امر کو جو کسی کی بُرائی کے متعلق ہو اسے اولوالامر تک پہنچانا چاہئے تا کہ وہ اس کی تحقیقات کرے اور پھر اگر وہ نقص ٹھیک ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اس لیکچر کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ ایک دن میں ختم ہو جائے لیکن جب مَیں نے اس کے نوٹ لکھے تو دو دن میں ختم ہو جانے کا خیال تھا۔ لیکن ابھی اصولی چالیس گُر باقی ہیں جو مَیں بیان

نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو کتاب میں لکھ دیئے جائیں گے یا کسی اور موقع پر بیان کر دیئے جائیں گے۔ چالیس گُر ابھی ایسے باقی ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان کس طرح نیک بن سکتا ہے۔

اب مَیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک بات پر اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایسی بات ہے جس میں آپ نے دکھ کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر ہم نیک نہ بنیں تو ہماری غرض جو اس جماعت کے بنانے سے ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس صورت میں ہماری جماعت خدا کے فضل کی وارث نہیں بن سکتی اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ ہم ان اخلاق کو پیدا کریں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے لئے ضروری قرار دیئے ہیں۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ وہ دوست جنہوں نے میرے اس سال کے لیکچروں کے نوٹ لئے ہیں اور جنہوں نے یہ لیکچر سنے ہیں وہ عملی طور پر ان طریقوں کو استعمال کریں گے تا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ظاہری اعمال میں بھی ہماری جماعت کے برابر اور کوئی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اگر ہماری جماعت کا ہر ایک شخص اولیاء اللہ میں سے نہ ہو تو دنیا کو نجات نہیں دلائی جا سکتی اور ہم دنیا میں کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتے۔ یاد رکھو ہمارا مقابلہ دنیا کی موجودہ بدیوں سے ہی نہیں بلکہ ہمارا فرض خیالات بد کی رَو سے مقابلہ کرنا بھی ہے۔ اور ہمیں خیالات کے اس دریا کا کا مقابلہ کرنا ہے جو ہر طرف لہریں مار رہا ہے۔ پس ہماری پوزیشن بہت ہی نازک ہے۔ مَیں احباب سے التجاء کرتا ہوں کہ احباب ایسا ہی بننے کی کوشش کریں جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیں بنانا چاہتے ہیں۔ اب مَیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعا پر اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں اور خود بھی اس دُعا میں شامل ہوتا ہوں۔

حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:۔

"مَیں کیا کروں اور کہاں سے ایسے الفاظ لاؤں جو اس گروہ (یعنی جماعت احمدیہ) کے دلوں پر کارگر ہوں۔ خدایا مجھے ایسے الفاظ عطا فرما اور ایسی تقریریں الہام کر جو ان کے دلوں پر اپنا نور ڈالیں اور اپنی تریاقی خاصیت سے ان کے زہر کو دُور کر دیں۔ میری جان اس شوق سے تڑپ رہی ہے کہ کبھی وہ دن ہو کہ اپنی جماعت میں بکثرت ایسے لوگ دیکھوں جنہوں نے درحقیقت جھوٹ چھوڑ دیا اور ایک سچا عہد اپنے خدا سے کر لیا کہ وہ ہر ایک شر سے اپنے تئیں بچائیں گے اور تکبر سے جو تمام شرارتوں کی جڑ ہے بالکل

دُور جا پڑیں گے اور اپنے رب سے ڈرتے رہیں گے دعا کرتا ہوں اور جب تک مجھ میں دمِ زندگی ہے کئے جاؤں گا اور دُعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ میری اس جماعت کے دلوں کو پاک کرے اور اپنا رحمت کا ہاتھ لمبا کر کے ان کے دل اپنی طرف پھیر دے اور تمام شرارتیں اور کینے ان کے دلوں سے اُٹھا دے اور باہم سچی محبت عطاء کر دے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ دُعا قبول ہو گی اور خدا میری دُعاؤں کو ضائع نہیں کرے گا"۔[۶]

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دُعا قبول ہو گی اور خدا تعالیٰ اسے ضائع نہیں کرے گا مگر تم سوچ لو تم اس کے مصداق بنو گے یا بعد میں آنے والے؟ اگر بعد میں آنے والوں کے حق میں قبول ہو گی تو پھر ہمیں کیا فائدہ؟ اس لئے میں کہتا ہوں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعا کو مدنظر رکھ کر کوشش کرو کہ ہم ہی اس کے مصداق ہوں اور اس نظارہ سے ہمیں ٹھنڈک پہنچے جو حضرت مسیح موعودؑ نے کھینچا ہے۔

اس کے بعد میں دُعا کر کے جلسہ ختم کرتا ہوں اور جنہوں نے جانا ہے ان کو اجازت دیتا ہوں۔

بک ڈپو والے کہتے ہیں میں سفارش کروں کہ اُن کی شائع کردہ کتابیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابیں ہیں احباب خریدیں۔ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کُتب کی اشاعت کریں۔ خود خریدیں اور پڑھیں اور ان کو دُنیا میں پھیلائیں یعنی دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

---

۱ آل عمران: ۱۹۱ تا ۱۹۶

۲ ابن ماجه کتاب النکاح باب حسن معاشرة النساء میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "خیرکم خیرکم لاهله وانا خیرکم لاهلی"

۳ التوبة: ۱۱۹

۴ ملفوظات جلد ۱ صفحہ ۲۰۵

۵ "واذاجاء هم امر من الامن اوالخوف اذاعوابه ولو ردوه الی الرسول و الی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم" (النساء: ۸۴)

۶، ۷ مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ باب نہی من اکل ثوما او بصلا او کراثا و نحوھا

۸ حقیقۃ الوحی صفحہ ۵ روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵

۹ دقیانوس۔ ایک ظالم حکمران جس کے عہد میں اصحاب کہف ہوئے۔

۱۰ رسالہ الوصیت صفحہ ۳۰ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۲۸

۱۱ ضمیمہ رسالہ الوصیت صفحہ ۲۱ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۹

۱۲ بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ الجمعۃ باب قولہ و اخرین منھم لما یلحقوا بھم۔

۱۳ المدثر: ۳۲ ۱۴ الذّٰریٰت: ۵۷ ۱۵ البقرۃ: ۱۳۰

۱۶ بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء نمبر ۱ صفحہ ۱۲

۱۷ بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف

۱۸ المومنون: ۱۳ تا ۱۵ ۱۹ القارعۃ: ۷ تا ۱۰ ۲۰ الاعلیٰ: ۱۰

۲۱ بدر ۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۵، ۱۶ تقریر جلسہ سالانہ ۲۲ الدھر: ۴

۲۳ بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالک

۲۴ سنن ابن ماجہ کتاب الادب باب الاستغفار

۲۵ بخاری کتاب التوحید باب السؤال باسماء اللہ تعالیٰ والاستعاذۃ بھا

۲۶ کنز العمال جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۹ مطبوعہ حلب ۱۹۷۷ء

۲۷ بخاری کتاب الاطعمۃ باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین

۲۸ بخاری کتاب الزکوۃ باب ما یذکر فی الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۹ بخاری کتاب القدر باب اللہ اعلم بما کانوا عاملین

۳۰

۳۱

۳۲ سیرت ابن ہشام عربی جلد ۱ صفحہ ۳۶۸، ۳۷۱ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۳۳ تذکرہ صفحہ ۱۸۴۔ ایڈیشن چہارم

۳۴ بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ المنٰفقون باب یقولون لئن رجعنا

الی المدینة لیخرجن الاعز.....

۳۵ اسد الغابة فی معرفة الصحابة جلد ۳ صفحہ ۱۹۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان ۱۳۷۷ھ

۳۶

۳۷ البقرة ۲۸۵ ۳۸ التغابن: ۱۷

۳۹ قلائد الجواهر فی مناقب الشیخ عبدالقادر جیلانی صفحہ ۳۶ مؤلفہ الشیخ محمد بن یحیی التادفی الحنبلی مطبوعہ عامرہ عثمانیہ پریس مصر ۱۳۰۳ھ

۴۰ درثمین میں یہ اشعار اس طرح ہیں

تیرے منہ کی ہی قسم میرے پیارے احمد تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

ہم ہوئے خیر امم تجھ سے ہی اے خیر رسل تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

۴۱ بخاری کتاب بدء الخلق باب اذا قال احدکم اٰمین والملئکة فی السماء اٰمین فوافقت احداهما الاخری غفر له ما تقدم من ذنبه

۴۲ سنن ابو داود کتاب الجهاد باب النهی عن الوسم فی الوجه والضرب فی الوجه

۴۳ مسلم کتاب الفضائل باب توقیره صلی الله علیه وسلم وترک اکثار سؤاله

۴۴ مسلم کتاب الذکر باب فضل مجالس الذکر

۴۵ بخاری کتاب الجمعة باب الطیب للجمعة

۴۶

۴۷ المعارج: ۲۵، ۲۶

۴۸

۴۹ هود: ۱۰۹ ۵۰ السجدة: ۱۶، ۱۷ ۵۱ یوسف: ۸۸

۵۲ بخاری کتاب التوحید باب یحذرکم الله نفسه

۵۳ الاعراف: ۱۵۷

۵۴ بخاری کتاب التعبیر باب الحلم من الشیطٰن

۵۵

۵۶ آل عمران:۱۸۹ ۵۷ النّٰزعٰت:۲ ۵۸ التین:۵
۵۹ ق:۱۷ ۶۰ المنٰفقون:۹ ۶۱ الحجر:۴۳
۶۲ یونس:۶۳ ۶۳ حٰمٓ السجدۃ:۳۲ ۶۴ یوسف:۸۸
۶۵ الفجر:۲۸تا۳۱
۶۶ بخاری کتاب التوحید باب کلام الرب مع جبریل و ندا. اللہ الملئکۃ
۶۷ الجاثیۃ:۱۴ ۶۸ الفتح:۳۰ ۶۹ التوبۃ:۱۱۹
۷۰ مسلم کتاب الذکر باب فضل مجالس الذکر
۷۱ الانبیاء:۳۵
۷۲ نہج البلاغۃ حصہ سوئم صفحہ ۹۱۳ قول نمبر ۲۴۳ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور میں "عرفت اللہ بفسخ العزائم" کے الفاظ ہیں۔
۷۳ ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۱۰۲، ۱۳۵
۷۴ بخاری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن
۷۵ مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب النھی من قال ھلک الناس
۷۶ شھادۃ القرآن صفحہ ۱۰۲ روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۹۸